جلد ۷۳ — اگست ۱۹۷۰ء — عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

۵ - الف ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

نئی نسل کو الحاد و مغربی تہذیب کے مضر اثرات سے بچانے کیلئے

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی معرکہ آرا تصنیفات

تنقیحات

مغربی تہذیب اور فلسفہ کا
بھرپور تجزیہ اور مدلل تنقید

اعلیٰ ایڈیشن : -/۶ روپے
سستا ایڈیشن : ۳/۲۵ روپے

مسئلہ قومیت

عصر حاضر کے سب سے عظیم بت
وطنیت اور قومیت پر زبردست تنقید
اسلامی قومیت کے ارکان و عناصر پر مفصل بحث

اعلیٰ ایڈیشن : ۳/۵۰ روپے
سستا ایڈیشن : ۲/۲۵ روپے

ابو الاعلیٰ مودودی

تعلیمات

- موجودہ نظامِ تعلیم کا تنقیدی جائزہ
- نئی نسل کے لیے جامع تعلیمی منصوبہ
- اساتذہ اور طلباء کے لیے بیش قیمت کتاب

اعلیٰ ایڈیشن : ۳/۲۵ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
۱۳۔ ای، شاہ عالم مارکیٹ ۔ لاہور
۱۶۔ بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۳	اگست ۱۹۷۰ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ	عدد ۶

مغربی پاکستان — مشرقی پاکستان

چندہ سالانہ: آٹھ روپے — ماہنامہ ترجمان القرآن — بذریعہ ہوائی ڈاک

فی پرچہ: ۸۰ پیسے — ۵۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔لاہور — فی پرچہ ۹۰ پیسے۔ سالانہ ۱۰ روپے

عام ڈاک سے: ۸۰ پیسے سالانہ ۸ روپے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ۔لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِشارات

ترجمان القرآن کی گذشتہ اشاعت میں ہم نے چند گزارشات اس ملک کے "غیر جانبدار طبقوں" اور اشتراکیت کے علمبرداروں کی خدمت میں پیش کی تھیں۔ اس مرتبہ ہم چند معروضات موجودہ برسرِ اقتدار طبقے خصوصاً صدر محترم سے بھی کرنا چاہتے ہیں اور اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ وہ ان معروضات پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔

سیاسی شعور کے موجودہ دور میں کوئی شخص بھی اس تلخ حقیقت کے اعتراف سے انکار نہیں کر سکتا کہ کسی ملک میں مارشل لاء کا نفاذ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہوتا جسے کوئی قوم محض دل بہلانے کے لیے وقتاً فوقتاً کھیلتی رہے۔ بلکہ یہ وہ آخری حربہ ہے جس کی مدد سے کسی ڈوبتی ہوئی قوم کو بچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب کوئی غیر ملکی قوم دوسری قوم پر مسلط ہو کر مارشل لاء نافذ کرتی ہے تو اس کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ محکوم عوام کو جبر و استبداد کے مجنونانہ ہتھکنڈوں سے دہشت زدہ کیا جائے اور انہیں یہ بتایا جائے کہ ان کی جان اور ان کے مال میں سے کوئی چیز بھی حکمرانوں کی دستبرد سے محفوظ نہیں ہے اور وہ جس طرح چاہیں انہیں تباہ و برباد کرنے کا پورا پورا اختیار اور حق رکھتے ہیں۔ اُن کے جو جی میں آئے وہ اسے بغیر کسی مزاحمت کے کر سکتے ہیں اور کوئی قانون اور ضابطہ اُن کی راہ نہیں روک سکتا۔ مگر جب کسی قوم کی اپنی فوج اپنے ہی ملک میں مارشل لاء نافذ کرتی ہے تو اس میں بلاشبہ ایک مقصد قوت کا اظہار بھی ہوتا ہے لیکن اس کے پیچھے یہ جذبہ بھی برابر کارفرما رہتا ہے کہ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ اگر شر و فساد کی قوتیں بے لگام ہو کر ملک کو تباہی و بربادی کے راستے پر لے جانے کے لیے مُصر ہوں اور رائے عامہ اور ملک کا عام قانون انہیں اس حرکت سے باز رکھنے سے عاجز ہوں تو

پھر فوج آگ اور خون کے اس خوفناک کھیل کی غیر متعلق تماشائی نہیں رہ سکتی بلکہ وہ ملک اور قوم کے تحفظ کے لیے انہیں اس کھیل سے روکنے کے لیے آگے بڑھتی ہے۔ مگر فوج کا ملک کے سیاسی معاملات میں یہ دخل بالکل عارضی اور ناگزیر ہوتا ہے۔ وہ اس امر کے لیے کوشاں رہتی ہے کہ جلد از جلد ملک کے حالات معمول پر آئیں تاکہ وہ اپنے اصل کام یعنی دفاعِ وطن کی طرف متوجہ ہو۔

مارشل لا کے بارے میں یہ وہ واضح حقیقت ہے جس کا ملک کی عظیم اکثریت، فوج اور خود سربراہ مملکت کو پوری طرح احساس ہے۔ جنرل یحییٰ خود بار بار اس امر کا اظہار کر چکے ہیں اور نہایت واضح الفاظ میں بتا چکے ہیں کہ وہ جلد از جلد اپنی بارکوں میں واپس جا کر اپنے اصل فرائض کی طرف پوری یکسوئی سے متوجہ ہونا چاہتے ہیں۔

فوج کو سیاسی اور انتظامی معاملات تفویض کرنے کے نقصانات سے ملک کا کوئی حساس انسان ناآشنا نہیں۔ ہر آدمی جو تھوڑی سی سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ فوج کے انتظامی اور سیاسی مشاغل پہلے اسے ایک سیاسی پارٹی بنا دیتے ہیں، پھر اس کے اندر دھڑے بندیوں کے لیے راہ پلنے کے مواقع پیدا ہو جاتے ہیں، اور آخر کار وہ ایک دفاعی طاقت کی حیثیت سے اپنی افادیت کھو دیتی ہے۔ اگرچہ ان جراثیم کا نفوذ بہت آہستہ ہوتا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ سرایت کرتے چلے جاتے ہیں۔ مزید براں کسی قوم کی فوج اس کا وہ بیش قیمت اثاثہ ہوتی ہے جس کے ساتھ ساری قوم کو اپنے اندرونی سیاسی اختلافات کے باوجود یکساں محبت ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر فرد اُسے اپنی جان و مال کا محافظ سمجھتا ہے۔ مگر جب وہ ملک کے انتظام و انصرام میں دخیل ہو جائے تو اُس کی وہ غیر جانبدارانہ حیثیت مجروح ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ ہر شہری کی آنکھ کا تارا ہوتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ قوم کے تعلقات کی نوعیت اُس سے مختلف نہیں ہوتی جو سول انتظامیہ کے ساتھ ہوتی ہے، اور یہ ممکن نہیں رہتا کہ کسی بیرونی خطرے کے مقابلہ میں وہ اور فوج یک جان ہو کر کھڑے ہو سکیں۔ مشرقِ وسطیٰ میں اس کے نتائج اس قدر واضح ہو کر سامنے آچکے ہیں کہ ان پر کسی بحث کی حاجت نہیں رہتی۔

صدرِ مملکت جنرل یحییٰ خان کو یہ بات خاص طور پر نگاہ میں رکھنی چاہیے۔ یہ حقیقت اگرچہ اپنی جگہ بڑی تلخ ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سابق صدر محمد ایوب نے محض ہوسِ اقتدار کی خاطر ملک میں مارشل لا نافذ کیا تھا ورنہ درحقیقت اُس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور پھر جن بُرائیوں کو دُور کرنے کے لیے یہ کارروائی کی گئی تھی اُن برائیوں میں کمی کیا ہونی تھی اُن میں پہلے سے بہت زیادہ اضافہ ہُوا۔ سابق صدر محمد ایوب کی اپنی خود نوشت سوانح حیات اس بات کی شاہد ہے کہ وہ پاکستان بننے کے چند سال بعد ہی سربراہِ مملکت بننے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ اور اس غرض کے لیے وہ مختلف منصوبے بنا رہے تھے۔ انہوں نے مارشل لا کسی ناگزیر ضرورت کے تحت نہیں لگایا تھا بلکہ اقتدار کی اندھی ہوس نے انہیں یہ خطرناک اقدام کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ عوام کا حافظہ بڑا کمزور ہوتا ہے اور وہ تلخیوں کو بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ لیکن اگر کسی وقت اس اقدام اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی خرابیوں کا بے لاگ جائزہ لیا گیا تو اس وقت انہیں یہ معلوم ہوگا کہ غلام محمد، سکندر مرزا اور فیلڈ مارشل صاحب کے اس فعل نے پُوری قوم کے اندر کس قسم کا خوفناک بگاڑ پیدا کیا ہے۔

مارشل لا کا اوّلین مقصد جیسا کہ ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے اجتماعی زندگی کی گاڑی کو جو پٹڑی سے اُتر گئی ہو دوبارہ پٹڑی پر لا کر رواں کر دینا ہوتا ہے۔ مگر سابق صدر نے سب سے پہلے سیاسی پٹڑی کو نقصان پہنچایا۔ ملک غلام محمد جیسا سرپھرا اور مطلق العنان مزاج کا آدمی محمد ایوب صاحب کی شہ پا کر مجنونانہ حرکات کرتا رہا اور اُن کی تائید کی وجہ سے اسے اس قدر جرأت ہوئی کہ اُس نے سارے آئین و ضوابط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا۔ پھر اسکندر مرزا کو آگے بڑھانے میں بھی فیلڈ مارشل صاحب نے پُوری جدوجہد کی اور اس طرح ملکی حالات کو آمریت کی پٹڑی پر ڈال کر خود موقع کی تلاش میں رہے کہ کسی وقت ذرا حالات سازگار ہوں اور وہ سب کو تختِ اقتدار سے ہٹا کر خود اُس پر براجمان ہو جائیں۔ اجتماعی زندگی کا نہج تیار کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اسے آسانی سے بگاڑا تو جا سکتا ہے مگر اسے سلوارنے میں بڑی وقت پیش آتی ہے۔ چنانچہ جب ان تینوں چاروں آمرانہ مزاج رکھنے والی شخصیتوں کی

ملی بھگت سے سیاسی زندگی میں غلط رجحانات اُبھرنے لگے تو انتظامی شعبے بھی ان سے شدید طور پر متاثر ہوتے اور عوام کے اندر اضطراب کی سی کیفیت پیدا ہوگئی اور وہ اس صورتِ حال سے سخت پریشان ہوگئے۔ ایوب صاحب نے اس سے فائدہ اٹھا کر فوراً اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ اور عوام جو بعض سیاستدانوں کی ریشہ دوانیوں اور بے اصولیوں سے نالاں تھے۔ انہوں نے فیلڈ مارشل صاحب کی ذات میں ایک "نجات دہندہ" ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ مارشل لا اُن کے سارے دکھوں کا درماں ہوگا اور محمد ایوب صاحب کی ذاتِ گرامی فوج کی تائید سے اُن کے سارے مسائل حل کرکے اُن کی اجتماعی زندگی کی گاڑی کو صحیح پٹڑی پر ڈال دے گی۔ مگر افسوس کہ عوام کو ایوب صاحب کے عزائم کو سمجھنے میں غلطی لگی۔ واقعات نے بتادیا کہ فیلڈ مارشل صاحب نے یہ کام حالات کو معمول پر لانے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ملک کو آمریت کی راہ پر ڈالنے کے لیے یہ سارا کھیل کھیلا تھا۔ وہ اپنے پیشِ نظر مخصوص سیاسی مقاصد رکھتے تھے جن کی تکمیل کے لیے انہوں نے مارشل لا کی راہ سے اقتدار حاصل کیا تھا۔

پہلے پہل تو انہوں نے مارشل لا کی فضا پیدا کرکے عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ ملک کے انتظام و انصرام کو بہتر بنانے کا عزم رکھتے ہیں۔ اس کے لیے بعض لوگوں کو گرفتار بھی کیا گیا اور بعض کو سزائیں بھی دی گئیں۔ مگر جلد ہی بلّی تھیلے سے باہر آگئی۔ فیلڈ مارشل صاحب نے عوام کے ذہنوں میں یہ بات ڈالنی شروع کی کہ جمہوریت پاکستان کے لیے تباہ کُن ہے اور اس کے تحت اہلِ پاکستان کوئی ترقی نہیں کرسکتے کیونکہ وہ جاہل ہونے کی بنا پر عقل و فکر سے عاری ہیں۔ اس لیے اُن کی نجات کی صورت بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ وہ ایک شخص کو اپنے سیاہ و سفید کا مالک بنادیں اور پھر آنکھیں بند کرکے اس کے اشاروں پر چلتے رہیں۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ اُن کے ذہنوں میں یہ خیال بھی مرتسم کیا گیا کہ اُن کے ہاں اس وقت جو قیادت موجود ہے اس میں سے کوئی فرد بھی مخلص اور قوم کا خیر خواہ نہیں۔ یہ سب طالع آزما اور ملک و ملت کے دشمن ہیں۔ ان سے کسی خیر اور بھلائی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

لے دے کر ملک میں صرف ایک ذات ہی بھروسے کے قابل رہ جاتی ہے اور وہ خود فیلڈ مارشل صاحب کی ذاتِ والاصفات ہے۔ ان خیالات کے پرچار کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر زبردست جدوجہد کی گئی۔ اور بلا مبالغہ اس میں اس غریب قوم کے کروڑوں روپے صرف ہوئے۔ پریس کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے جن میں صرف سابق صدر صاحب کی مدح و ستائش کے سوا اور کسی بات کا تذکرہ قریب قریب ناممکن بن گیا۔ مختلف قوانین کے ذریعے لوگوں کی زبان بندی کی گئی اور انہیں اس بات پر مجبور کر دیا گیا کہ اگر وہ زبان کھولیں تو صدر صاحب کی تعریف و توصیف میں کھولیں ورنہ خاموش رہیں۔ پھر ان کے فرضی کارناموں کو مختلف طریقوں سے اُچھالا گیا۔ اور کسی شخص کو اجازت نہ دی گئی کہ وہ ان کا بے لاگ جائزہ لے سکے۔

اس کے علاوہ ہر آمر کی طرح ایسے نمائشی کام کیے گئے جو کسی حقیقی قدر و قیمت کے حامل نہ تھے۔ مگر جن کی وجہ سے اُن کی شخصیت کو اُبھارنے میں مدد مل سکتی تھی۔ بڑے بڑے شہروں میں سرکاری خرچ پر عالیشان عمارات کی تعمیر، اسلام آباد میں نئے دار السلطنت کا قیام اور عظیم الشان ہوٹلوں اور ہالوں کی تعمیر پر نہ صرف ملکی روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا بلکہ غیر ممالک سے نہایت اُونچی شرحِ سُود پر قرض لے کر بھی ان غیر پیدا آوری منصوبوں کی تکمیل کی گئی۔ ان منصوبوں میں شاید ہی کوئی منصوبہ معاشی نقطۂ نظر سے اپنے اندر افادیت کا کوئی پہلو رکھتا ہو، بلکہ ان سب کی غرض ایک ہی تھی کہ کسی طرح اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک یہ تاثر قائم کیا جا سکے کہ قوم فیلڈ مارشل صاحب کی قیادت میں حیرت انگیز ترقی کر رہی ہے۔ اس وقت کے اخبارات پڑھنے سے ہر شخص بآسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ اس ملک کی اجتماعی سرگرمیوں کا محور صرف صاحبِ صدر کی ذات تھی اور اُن کا مقصد ان کی شخصیت کو اُبھارنا تھا۔ اسی مسلکِ شخصیت (PERSONALITY CULT) کے پیشِ نظر تمام شعبوں کی تنظیم کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پورے ملک کے بارے میں یہ تاثر قائم کیا گیا کہ یہاں فہم و شعور رکھنے والے لوگ آباد نہیں بلکہ بھیڑوں کے گلے چر چگ رہے ہیں جنہیں صرف اقتدار کی لاٹھی ہانک کر صحیح راستے پر چلا سکتی ہے۔

اس قسم کے نمائشی اور غیر پیدا آوری منصوبوں سے ملک کی معاشی حالت بالکل تباہ ہو گئی۔

مارشل لا کی "برکات" کا ذکر کرتے ہوئے محمد ایوب خان نے عوام کو دوسرا مُژدہ یہ سنایا تھا کہ ملک کی انتظامیہ میں جو خرابیاں موجود ہیں وہ دُور کی جائیں گی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ نمائندہ حکومت میں سرکاری ملازم عوام کے نمائندوں کے دباؤ میں آکر غلط کام کر دیتے ہیں یا اگر حکومت اُن کا احتساب کرنے لگے تو وہ بدعنوان سرکاری افسروں کی پُشت پناہی کرتے ہیں۔ اس طرح ملک کا نظم خراب ہو جاتا ہے۔ فیلڈ مارشل صاحب نے ملک کے باشندوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اُن کی آمریت سے اس نوع کی ساری بدعنوانیاں ختم ہو جائیں گی۔ عوامی نمائندوں کے ناجائز دباؤ کے تحت نہ تو سرکاری افسر غلط کام کرنے پر مجبور ہوں گے اور نہ یہ غلط کار نمائندے بدقماش افسروں سے ناجائز مفادات کے حصول کی خاطر انہیں احتساب سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ اور اس طرح ملک کی انتظامی مشینری ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہو کر دیانتداری اور مستعدی سے اپنے فرائض کو سرانجام دینے کے قابل ہو جائے گی۔ مگر افسوس کہ فیلڈ مارشل صاحب نے مارشل لا کے نفاذ سے عوام کو بہتر انتظامیہ کی جو توقع دلائی تھی وہ بھی پوری نہ ہو سکی بلکہ اس کے اندر پہلے سے بڑھ کر ناقابلِ بیان انحطاط اور بگاڑ پیدا ہو گیا۔ اس کی وجہ بھی سابق صدر کے مذموم عزائم تھے۔ اگر اُن کے پیشِ نظر صرف یہی بات ہوتی کہ فوج کی قوت سے بڑی بڑی بدعنوانیوں کو دُور کر کے اقتدار عوام کی طرف منتقل کر دیں تو وہ ایک سال کے اندر اس کام کو بخوبی سرانجام دے سکتے تھے۔ انہوں نے جن حالات اور جس جذباتی فضا میں مارشل لا نافذ کیا اس میں ان کے لیے یہ کام کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر چونکہ اُن کے عزائم کچھ دوسرے تھے اور وہ اقتدار کی مسند پر بلا شرکتِ غیرے تاحیات متمکن رہنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جس سے انتظامیہ بالکل تباہ ہو گئی اور اس میں وہ ساری برائیاں بدرجۂ اَتم پیدا ہو گئیں جن کے ذمہ دار پہلے عوامی نمائندے قرار دیئے جاتے تھے۔ فیلڈ مارشل صاحب نے اپنی آمریت کو مدتِ دراز تک قائم رکھنے کے لیے عوام اور سرکاری افسروں میں سے ایسے لوگ تلاش کیے جو اُن کی خوشنودی کی خاطر ہر جائز و ناجائز کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ "مردانِ کار" فراہم ہو جانے

کے بعد فیلڈ مارشل صاحب اور ان کے حواریوں نے ان سے ایسے ایسے کام لیے جن کے تصور سے رُوح کانپ اٹھتی ہے۔ اقتدار کے ان خیر خواہوں نے سابق صدر کی رضا جوئی کے لیے بالکل بے خوف ہو کر عوام کو اپنے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنایا۔ یہ سرکاری افسر اس حد تک بے باک اور جری ہو چکے تھے کہ اسمبلی کے اندر گھس کر عوامی نمائندوں کو مارنے اور گالیاں دینے سے گریز نہ کرتے تھے۔ پوری آبادی نوکر شاہی کے ہاتھوں بے بس تھی اور وہ اس کے خلاف کوئی فریاد بھی نہ کر سکتی تھی۔ بدعنوان سیاستدانوں" کے دور میں عوامی نمائندوں کو کم از کم اتنی آزادی تو ضرور تھی کہ ظالم اور سفاک افسروں کے ظلم و استبداد کے خلاف اسمبلی کے اندر اور باہر آواز اُٹھا سکیں، مگر ایوب صاحب کی آمریت میں وہ اس حق سے بھی محروم کر دیئے گئے۔ کسی فرد یا جماعت کو اُن افسروں کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ تھی جو اقتدار کے لیے مفید ہونے کی وجہ سے اس کے منظورِ نظر تھے۔ آج اخبارات میں آئے دن ان افسروں کے رُوح فرسا مظالم کے جو واقعات سامنے آتے رہتے ہیں یہ سب نوکر شاہی کے اس مطلق العنان مزاج کے نتائج ہیں جسے سب سے زیادہ غذا ایوب صاحب کی آمریت نے فراہم کی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ فیلڈ مارشل صاحب نے مارشل لا کے ذریعے بہتر انتظامیہ کی بجائے بدتر انتظامیہ کو جنم دیا ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

فیلڈ مارشل صاحب نے سب سے پہلے دستور سے بدعہدی کرتے ہوئے مارشل لاء کا نفاذ کیا، اور پھر مارشل لاء سے یہ بدعہدی کی کہ اس کی دہشت پسندانہ فضا میں ایسے کام کرنے شروع کیے جن کا تعلق لوگوں کے دین اور ایمان سے تھا۔ مارشل لاء کا اگر کوئی مقصد ہو سکتا تھا تو صرف یہ کہ اگر کچھ قوتیں دھونس دھاندلی اور جبر و تشدّد سے اقتدار قوم کے صحیح نمائندوں کی طرف منتقل ہونے میں مزاحم ہو رہی ہوں تو انہیں اس سے باز رکھا جائے اور ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن کے تحت اقتدار کی باگیں قوم کے حقیقی نمائندوں کے ہاتھ میں پُرامن طریقے سے منتقل ہو جائیں اور کوئی گروہ محض غنڈہ گردی کے ذریعے اس میں رکاوٹ نہ پیدا کرے۔ ملک کے اندر خود ملکی فوج کے

ہاتھوں مارشل لا کے نفاذ کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔ مگر فیلڈ مارشل صاحب نے مارشل لاء کے اس بنیادی تقاضے کے بالکل برعکس فوج سے حاصل ہونے والی قوت کی مدد سے اپنے دل پسند افکار کا پرچار شروع کیا اور لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ انہیں اپنانے کی کوشش کریں۔ مارشل لاء کا یہ کارنامہ صرف سوشلسٹ ممالک یا پھر پاکستان میں سابق صدر محمد ایوب صاحب کے دورِ اقتدار میں دیکھا گیا ہے کہ اس کے ذریعے ملک کے اندر عوام کے منشا و مرضی کے علی الرغم صاحبِ اختیار اپنا ایک خاص نظامِ فکر و عمل رائج کرنے کی کوشش کرے۔ جو لوگ افکار و نظریات کے اندر انقلاب یا قوم کے معاشرتی اور اجتماعی ڈھانچوں میں تبدیلیاں لانے کے اخلاص کے ساتھ آرزومند ہوتے ہیں وہ کبھی مارشل لا کے راستے کو منتخب نہیں کرتے بلکہ اُس معقول اور سیدھے راستے کو اختیار کرتے ہیں جو اس انقلاب اور تغیر کا فطری راستہ ہے۔ وہ فوج، پولیس یا اقتدار کی تائید کے بغیر خالص دلائل کی قوت کے ساتھ اپنے تصورات اور عزائم پیش کر کے عوام کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ اور جب اکثریت اُن کے پیش کردہ خیالات کی صحت اور افادیت کی قائل ہو جائے تو پھر وہ ان کے مطابق ملک کے اندر تبدیلیاں لاتے ہیں۔ کیونکہ اگر ان فطری مراحل سے گزرے بغیر فکر و عمل کا کوئی انقلاب لایا جائے تو ایک تو وہ دیرپا ثابت نہیں ہوتا، دوسرے اس کے لیے بڑے جبر و تشدد سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہی حال ایوب صاحب کے انقلابی پروگرام کا تھا۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنی تحریروں اور تقریروں میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے انہیں پڑھنے سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ مذہبی اور دینی معاملات میں اُن کے سوچنے کا انداز اور ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے اُن کے پیشِ نظر پروگرام اِس ملک کے عوام کے دینی مزاج اور قومی امنگوں سے مختلف تھا۔ انھیں ہر لمحہ "وقت کے تقاضوں" کا احساس ستاتا رہتا تھا۔ اور وہ ان تقاضوں سے اتنے متاثر تھے کہ وہ دین کو اُن کے مطابق تبدیل کرنے کے درپے تھے۔

اللہ نے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اسلام کی صورت میں ہمیں ایک نظام

عطا فرمایا ہے جو انسانیت کے لیے ابدی ہدایت کا موجب ہے اور جس کی اطاعت اور فرمانبرداری ہی سے انسان دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کی دنیوی اور اُخروی فلاح کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اپنے افکار و اعمال کو اللہ کے دین کے مطابق ڈھالے۔ مگر فیلڈ مارشل صاحب نے اس قوم کو دین کے بارے میں یہ نظریہ دیا کہ مذہب انسان کے لیے ہے، انسان مذہب کے لیے نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنے فکر و عمل کے ڈھانچوں کو مذہب کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت نہیں بلکہ مذہب کو انسانی خواہشات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیل کر دینا چاہیے۔ فیلڈ مارشل صاحب کے نزدیک چونکہ ہر دور کے اپنے مخصوص تقاضے ہوتے ہیں اس لیے مذہب کو اُن کے ساتھ تبدیل ہوتے رہنا چاہیے۔ یہ نظریہ مذہب کے لیے جس قدر تباہ کن ہے اس کا بظاہر اندازہ نہیں ہوتا، مگر جب اس باطل خیال کے عملی مضمرات سامنے آتے ہیں تو پھر معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو مذہب کو بیخ و بُن سے اکھاڑنے والا نظریہ ہے۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ مذہب کو ہر دور کے مطابق تبدیل ہونا چاہیے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کی کوئی قدر، اس کا کوئی اصول اور ضابطہ، اس کا کوئی نظامِ اخلاق و معاشرت، الغرض اس کی کوئی چیز بھی مستقل اور پائیدار نہیں بلکہ ہر چیز وقت کے گزرنے کے ساتھ بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ فیلڈ مارشل صاحب اس قسم کے گمراہ کن نظریات کا کہیں دبے لفظوں میں اور کہیں کھل کر اظہار بھی کرتے رہے۔ اپنی ایک تقریر میں جو انہوں نے فوجی افسروں کے مخصوص اجتماع میں کی، یہ بات برملا کہی کہ آخر یہ چیز کس حد تک قرینِ قیاس ہو سکتی ہے کہ ایک غیر مہذب اور غیر ترقی یافتہ معاشرے کے چودہ سو سال پُرانے قوانین کو آجکل نافذ کر دیا جاتے؟ اُن کی نگاہ میں اسلام کے صرف دو اصول مستقل قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ ایک توحید اور دوسرے مساوات۔ ان دو اصولوں کے علاوہ ہر اصول بوسیدہ ہونے والا ہے۔

یہ تھا دین کے بارے میں وہ نظریہ جو فوج اور سول سروس کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے اور نشر و اشاعت کے سرکاری وسائل کے بل بوتے پر فیلڈ مارشل صاحب نے ملک میں پھیلانا شروع کیا۔

اشتراکی ممالک کو چھوڑ کر کیا کسی ایک ملک کی بھی نشاندہی کی جاسکتی ہے جہاں فوج اور انتظامیہ کی مدد سے لوگوں پر کوئی صاحبِ اختیار اپنے دل پسند نظریات ٹھونسنے کی کوشش کرے؟ اسلامی تاریخ میں خلافتِ راشدہ کے سنہری دَور کو تو چھوڑیے، وہ تو ہر لحاظ سے انسانیت کے لیے خیر اور بھلائی کا مثالی دَور تھا۔ مطلق العنان فرماں رواؤں تک نے یہ طرزِ عمل اختیار کرنے سے اجتناب کیا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے جب فقہِ مالکی کو قانون کے ذریعے رائج کرنے کا ارادہ کیا تو خود اس فقہ کے مُرتّب نے خلیفہ کے اِس اقدام کی مخالفت کی۔ مگر فیلڈ مارشل صاحب نے ان ساری اچھی اور صحت مندانہ روایات کو یکسر نظر انداز کر کے اس ملک کی عظیم اکثریت کے نظریات بدلنے کے لیے بھرپُور جدوجہد شروع کی۔ اُن کے اس غلط طرزِ عمل سے ملک کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ غیر اسلامی نظریات رکھنے والے لوگوں نے فیلڈ مارشل صاحب کے سایۂ عاطفت میں رہ کر اور اُن کی شہ پا کر اپنے باطل افکار کا پرچار شروع کیا۔ انہوں نے ایک طرف حکومت کے انتظامی شعبوں میں گھس کر ملک کے اندر اثر و رسوخ حاصل کیا اور دوسری طرف نشر و اشاعت کے ذرائع پر قابض ہو کر اپنے خیالات عوام کے ذہنوں میں اُتارنے کی جدوجہد شروع کی۔ فیلڈ مارشل کی نفسیاتی کمزوری کو انہوں نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا کہ وہ ذہنی اعتبار سے آمر ہیں اور اقتدار کے ساتھ زیادہ سے زیادہ عرصے کے لیے چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔ اس لیے انہیں خوش رکھنے کے لیے صرف ایک ہی چیز کی ضرورت ہے کہ اُن کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جائیں اور جو لوگ اُن سے ذرا اختلاف رکھتے ہیں یا جن کے سوچنے کا انداز سابق صدر سے ذرا مختلف ہے انہیں ہر طرح سے بدنام کیا جاتے، اور فیلڈ مارشل صاحب کو یہ باور کرایا جائے کہ یہ لوگ اُن کے دشمن ہیں اور ان کے کاموں میں خواہ مخواہ کیڑے ڈالتے رہتے ہیں۔ خوشامد پسند انسان کا ہمیشہ سے یہ مقدر رہا ہے کہ وہ اپنے حقیقی خیر خواہوں سے دُور ہو کر طالع آزماؤں اور مفاد پرستوں کے نرغے میں گھر جاتا ہے جو اُسے خوش کُن باتیں سُنا کر حقائق سے غافل رکھتے ہیں اور بالآخر اس کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ فیلڈ مارشل صاحب کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہُوا۔ ملحدانہ افکار رکھنے والے لوگوں اور مفاد پرستوں نے سابق صدر صاحب کی اِس کمزوری سے پُورا پُورا فائدہ اٹھایا اور اُن کے دل میں ان لوگوں، جماعتوں اور گروہوں سے

بدگمانیاں پیدا کردیں جو اس ملک کے اور خود اُن کے حقیقی خیر خواہ تھے اور اس بنا پر انہیں ان کی غلط روش پر ٹوکتے تھے۔ اور انہیں خبردار کرتے تھے کہ وہ خود بھی اور ملک کو بھی بڑی خطرناک راہ کی طرف لے جا رہے ہیں مگر انہوں نے خیر خواہی کے اِن سارے مشوروں کو اپنے خلاف چیلنج سمجھا اور نصیحت کرنے والوں کو اپنا دشمن سمجھ کر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔

اس طرح خادمِ دین اور ملک کے بہی خواہ تو معتوب ہوئے اور اس خطۂ پاک میں غیر اسلامی نظریات کے علمبرداروں، مفاد پرستوں، طالع آزماؤں اور ضمیر و ایمان بیچنے والوں کو اس بات کی کھلی چھٹی مل گئی کہ وہ سرکار کی سرپرستی میں اپنی غیر اسلامی اور غیر اخلاقی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان لوگوں نے ایک طرف ناجائز ذرائع سے بے تحاشا دولت حاصل کی اور دوسری طرف سرکاری اخراجات سے اسلام کے خلاف مختلف قسم کی سازشیں کیں۔ ثقافت اور آرٹ کے نام پر نوجوانوں کے اخلاق کو بگاڑا۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعے ان کے دماغوں میں باطل افکار کی آبیاری کرنے کی کوشش کی۔ پھر مقامی بولی اور مقامی کلچر کے نام پر جگہ جگہ علاقائی عصبیتوں کو ابھارا۔ اور اس طرح اسلام کے اُس مضبوط رشتے کو شدید نقصان پہنچایا جو پاکستان کے قیام کا واحد محرک، اس کے حفظ و بقا کی سب سے بڑی ضمانت، اس کے باشندوں کے مابین، سب سے مضبوط رشتۂ اخوت اور اس کی تعمیر و ترقی میں ایک زبردست ولولے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسلام کے بغیر پاکستان کا تخیل، وجود اور اس کا مستقبل خواب پریشاں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اگر یہاں اسلام آئے تو یہ ملک زندہ بھی رہ سکتا ہے اور ترقی کر کے دوسرے مسلم ممالک کے لیے سہارا بھی بن سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ اسلام کا گہوارہ نہیں بن سکتا تو پھر اس کی حیثیت راکھ کے ڈھیر سے زیادہ نہیں جسے باطل کی آندھیاں بڑی آسانی سے منتشر کر سکتی ہیں۔ سابق صدر نے پاکستان کی اس رگِ جان کو بلاواسطہ اور بالواسطہ نقصان پہنچایا۔ دین کے بارے میں وہ اپنے جو نظریات

رکھتے تھے وہ تو اکبر کے دینِ الٰہی کی طرح محض وقتی اور ناپائیدار ثابت ہوئے۔ کسی فرد نے بھی انہیں دل و جان سے قبول نہ کیا۔ اُن کے دورِ اقتدار میں دو چار افراد کسی نہ کسی طرح تذکرہ کرتے رہے مگر ان کے اقتدار سے ہٹنے کے ساتھ اُن کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہا۔ البتہ کفر اور الحاد نے اُن کی آمریت کے سائے میں خاصی ترقی کی اور اشتراکیت پسند اور لادین عناصر کو یہ جرأت ہوگئی کہ وہ کھُل کر اللہ کے دین کے خلاف باتیں کریں۔ یہ جو کچھ ہوا ایک آمر کی تائید و حمایت اور اس کی شہ پر ہوا۔ اگر فیلڈ مارشل صاحب کی ہمہ مقتدر شخصیت ان عناصر کی محافظت اور پاسبانی نہ کرتی اور حکومت کے وسائل اور اس کی قوت سے انہیں فائدہ اٹھانے کے مواقع فراہم نہ کرتی اور انہیں قومی زندگی کے مراکزِ اعصاب پر مسلط ہوکر اپنی طاقت کے بل بوتے پر کام کرنا نصیب ہوتا تو پھر نہ تو یہ عناصر اتنے جری ہو سکتے تھے جتنے آج نظر آتے ہیں اور نہ ان کی سرگرمیاں اتنی تیز ہو سکتی تھیں جتنی اس وقت دکھائی دیتی ہیں۔ اس وقت ملک میں جو فکری اور ذہنی خلفشار موجود ہے وہ سب ایوب خانی مارشل لاء کے نفاذ اور اس سے بڑھ کر اس کے غلط استعمال کا بالکل فطری نتیجہ ہے۔ اگر فیلڈ مارشل صاحب صرف حالات کو معمول پر لانے کا ایک ذریعہ سمجھ کر اس طاقت کو استعمال کرتے تو آج عوام کے اندر اپنے مستقبل کے بارے میں جو مایوسی اور پریشاں فکری نظر آتی ہے وہ کبھی پیدا نہ ہوتی۔

ہم نے سابقہ مارشل لاء اور اس سے پیدا ہونے والے چند نتائج کا صرف اس لیے ذکر کیا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ جو لوگ یہ انتہائی قدم اٹھاتے ہیں انہیں فکر و عمل میں کس حد تک محتاط اور چوکس رہنا چاہیے۔ کیونکہ اس معاملے میں ذرا سی غفلت بڑے سنگین نتائج پیدا کر دیتی ہے۔ دلوں کے راز تو خدا جانتا ہے، لیکن اب تک موجودہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر محمد یحییٰ صاحب نے اپنی تقریروں میں اس عزم کا بار بار اظہار کیا ہے کہ وہ نہ تو خود تختِ اقتدار پر مسلط رہنا چاہتے ہیں اور نہ مارشل لاء کو طول دینے کے حق میں ہیں، بلکہ اس بات کے پوری طرح آرزومند ہیں کہ اقتدار کو عوام کے نمائندوں کی طرف منتقل کر کے فوج کو اپنے اصل کام کی طرف متوجہ کر دیں۔ اپنے اس عزم کا ثبوت انہوں نے

انتخابات کی تاریخ کا اعلان کرکے اور بالغ رائے دہندگی کے تحت براہِ راست انتخابات کا انتظام کرکے بہم پہنچا دیا ہے۔ اس وقت تک ان کے طرزِ عمل سے ایسی کوئی بات ظاہر نہیں ہوئی جس سے اُن کے عزم کے بارے میں شبہ کیا جاسکے۔

لیکن دو تین باتیں ہیں جن کی طرف ہم انہیں توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ سابق صدر صاحب نے حکومت کی طرف سے غیر اسلامی عناصر کی حوصلہ افزائی کا جو ماحول پیدا کر رکھا تھا اُسے ختم کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ اس میں بلاشبہ دخل ایوب صاحب سے پہلے کی حکومتوں کا بھی ہے مگر فیلڈ مارشل صاحب کے دَورِ اقتدار میں عوام کے اندر یہ تأثر پوری طرح قائم ہوگیا تھا کہ حکومت اسلامی عناصر کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور ان کے مقابلے میں غیر اسلامی نظریات کے حامل اور مغربی طرزِ زندگی کے شیدائی لوگوں کو ملک وملت کے لیے زیادہ مفید اور کارآمد سمجھ کر اُن کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ یہ تأثر جتنی جلدی ختم ہوجائے اسی قدر پاکستان کے لیے فائدہ مند ہے، کیونکہ اس تاثر کی وجہ سے یہاں رضائے عامہ (GENERAL WILL) اُبھر کر قوتِ حاکمہ بننے نہیں پاتی۔ اس ملک کی عظیم اکثریت اسلامی نظام کی طالب ہے مگر حکومت کے ایوانوں میں اگر غیر اسلامی عناصر کی پذیرائی ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ حکومت اسلامی نظام کے قیام کی حامی نہیں ہے بلکہ محض لوگوں کے جذبات سے کھیل رہی ہے اور درحقیقت اسلام کے نام پر کوئی دوسرا نظامِ حیات یہاں مسلط کرنا چاہتی ہے۔

ان تاثرات کی مسموم فضا میں غلط عناصر کو اجتماعی زندگی میں تقویت حاصل ہوتی ہے جس سے فائدہ اٹھاکر یہ عناصر اپنی اصل قوت سے کہیں زیادہ قوت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں اور اس طرح "خاموش اکثریت" کی ایک اچھی خاصی تعداد کو دھوکہ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں۔

صدر محترم نے مختلف سیاسی پارٹیوں اور گروہوں کے مابین جو غیر جانبدارانہ روش اختیار کر رکھی ہے وہ یقیناً قابلِ قدر ہے۔ ہم ان سے قطعاً یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ وہ کسی کی طرف داری کریں۔ مگر ان

کی خدمت میں یہ گزارش ضرور کریں گے کہ وہ اُس تاثر کو ضرور مٹانے کی کوشش کریں جو ایک مدت سے حکومت کی غلط روش کی بدولت قائم ہو چکا ہے۔ اس تاثر کو مٹانے کے لیے یوں تو ایک وسیع اور لمبے منصوبے کی ضرورت ہے مگر چند ایک اقدامات ایسے ہیں جن سے اسے کسی حد تک تھوڑی مدت کے اندر زائل کیا جا سکتا ہے۔

(۱) سرکاری ملازموں میں خصوصاً اونچے عہدوں پر جو لوگ فائز ہیں ان کا سختی سے محاسبہ کیا جائے اور ان میں سے جن افراد کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اپنی سرکاری حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر باطل نظریات کا پرچار کرتے ہیں یا غیر اسلامی رجحانات اور عناصر کو تقویت دینے میں مددگار ثابت ہو رہے ہیں، انہیں ان عہدوں سے ہٹا دیا جائے۔ کیونکہ سرکاری خزانے سے تنخواہ پانے والے لوگوں کو اس بات کا قطعاً حق نہیں پہنچتا کہ وہ اِن عہدوں پر براجمان ہو کر عوامی امنگوں کے خلاف سازش کریں۔

(ب) دوسرے وہ لوگ جو فیلڈ مارشل صاحب کے دَور میں محض دینی خیالات اور رجحانات کی وجہ سے معتوب تھے ان کے ساتھ اب ایسا رویہ جاری نہ رہنا چاہیے جس سے یہ ظاہر ہو کہ اب بھی وہ معتوب ہی ہیں۔ یہ کس قدر ظلم ہے کہ کسی عنصر کو محض اس لیے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جائے یا بلنے دیا جاتے کہ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ میں اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کا خواہاں ہوں اور دوسرے عنصر کے ساتھ صرف اس لیے نرمی برتی جائے کہ وہ مخالفِ اسلام نظریات یا ملک کی وحدت کو نقصان پہنچانے والے خیالات رکھنے کے باوجود سابق حکومت کی سرپرستی کے باعث کافی طاقت پکڑ چکا ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ سال میں اس کی کئی مثالیں پے در پے سارے ملک کے سامنے آ چکی ہیں، اس لیے ان کے بیان کی حاجت نہیں ہے، لیکن اگر ضرورت ہو تو ان کو ایک ایک کر کے گنایا جا سکتا ہے۔

دوسری چیز جس کی طرف ہم خاص طور پر صدر صاحب کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں وہ ملک

میں ایک ایسی پُرامن فضا کا قیام ہے جس کے اندر قومی امنگیں رائے عامہ کی صورت اختیار کر کے قوتِ حاکمہ بن سکتی ہیں۔ صدرِ محترم اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ووٹ صرف اسی صورت میں عوامی رجحانات کی صحیح طور پر عکاسی کر سکتا ہے جب ملکی فضا امن سے معمور ہو اور ہر فرد یہ محسوس کرے کہ وہ کسی ڈر اور خوف کے بغیر اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے۔ جنرل یحییٰ نے جس طرح انتخابات کے انعقاد کے لیے بڑے عزم کا ثبوت دیا ہے اسی طرح اُن پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اسے کامیابی کے مراحل سے گزارنے کے لیے عوام کے ذہنوں سے دہشت اور یاس و قنوطیت کے احساسات کو دُور کریں۔

اس وقت ملک میں بعض افراد اور بعض سیاسی جماعتیں جس طرح بدامنی اور دہشت پھیلا رہی ہیں اس سے عوام سخت خوفزدہ ہیں اور ان کے دل میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہو رہی ہیں اور کبھی کبھی وہ اس انداز پر سوچنے لگتے ہیں کہ کیا انتخابات عملاً منعقد ہوں گے بھی؟ مایوسی کی اس فضا میں کیا کوئی امن پسند جماعت یا گروہ یکسوئی کے ساتھ اپنی انتخابی سرگرمیاں جاری رکھ سکتا ہے؟

اس صورتِ حال کا ایک اور نقصان بھی ہے جس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ آج سے چند سال پیشتر امن عامہ کو برباد کرنے والے لوگ اپنے الگ دھڑے رکھتے تھے۔ بعض سیاسی کھلاڑی ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کی پشت پناہی کرتے تھے مگر سیاسی جماعتیں ان کے وجود سے زیادہ تر پاک رہتی تھیں۔ مگر موجودہ فضا میں ان لوگوں کی غیر معمولی افادیت کے پیشِ نظر بعض جماعتوں نے انہیں براہِ راست اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب یہ غیر ذمہ دارانہ عناصر سیاسی سٹیج سے اپنی سماج دشمن سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوتے ہیں اور ان کی جماعتیں اور ان کے لیڈر ان کی ہر معاملے میں تائید اور حمایت کرتے ہیں۔ سیاست کے اندر غنڈہ گردی کا یہ رجحان بڑا خطرناک ہے۔ اس کا عملاً نتیجہ یہ ہو گا کہ شرفاء تو گھروں میں دبک کر بیٹھ جائیں گے اور چند افراد ان غنڈہ عناصر کی مدد سے میدان مار لیں گے۔ اگر یہی صورتِ حال کچھ مدت تک قائم رہی تو ملک کی عنانِ اقتدار براہِ راست تخریب پسند عناصر کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ اس ملک کے سارے بہی خواہوں کو اس

(باقی صفحہ پر)

تفہیم القرآن

المُدَّثِّر

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْمُدَّثِّر کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی صرف نام ہے مضامین کا عنوان نہیں ہے۔

زمانۂ نزول | اس کی پہلی سات آیات مکہ معظمہ کے بالکل ابتدائی دور کی نازل شدہ ہیں بعض روایات جو بخاری، مسلم، ترمذی اور مُسند احمد وغیرہ میں حضرت جابر بن عبداللہ سے منقول ہیں ان میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ یہ قرآن مجید کی اولین آیات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں لیکن اُمت میں یہ بات قریب قریب بالاتفاق مسلّم ہے کہ پہلی وحی جو حضورؐ پر نازل ہوئی وہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ سے مَا لَمْ يَعْلَمْ تک ہے۔ البتہ صحیح روایات سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ اس پہلی وحی کے بعد کچھ مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی وحی نازل نہیں ہوئی، پھر اس وقفہ کے بعد جب از سرِ نو نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو اُس کا آغاز سورۂ مدثر کی انہی آیات سے ہوا تھا۔ امام زہریؒ اس کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں:

"ایک مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول بند رہا اور اُس زمانہ میں آپ پر اس قدر شدید غم کی کیفیت طاری رہی کہ بعض اوقات آپ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے لیکن جب کبھی آپ کسی چوٹی کے کنارے پر پہنچتے جبریل علیہ السلام نمودار ہو کر آپ سے کہتے کہ آپ اللہ کے نبی ہیں۔ اس سے آپ کے دل کو سکون حاصل ہو جاتا تھا اور وہ اضطراب کی کیفیت دُور

ہو جاتی تھی"۔ (ابن جریر)

اس کے بعد امام زہری خود حضرت جابر بن عبداللہ ہی کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فترۃ الوحی (وحی بند رہنے کے زمانے) کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا: ایک روز میں راستے سے گزر رہا تھا۔ یکایک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی، سر اٹھایا تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا تھا، آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں یہ دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہو گیا اور گھر پہنچ کر میں نے کہا مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ۔ چنانچہ گھر والوں نے مجھ پر لحاف (یا کمبل) اُڑھا دیا۔ اس وقت اللہ نے وحی نازل کی يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ...... پھر لگاتار مجھ پر وحی کا نزول شروع ہو گیا"۔ (بخاری۔ مسلم۔ مسند احمد۔ ابن جریر)

سورۃ کا باقی ماندہ حصہ آیت ۸ سے آخر تک اُس وقت نازل ہوا جب اسلام کی علانیہ تبلیغ شروع ہو جانے کے بعد مکہ میں پہلی مرتبہ حج کا موقع آیا۔ اس کا مفصل واقعہ سیرت ابن ہشام میں بیان کیا گیا ہے جسے آگے چل کر ہم نقل کریں گے۔

موضوع اور مضمون جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی جو بھیجی گئی تھی وہ سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات پر مشتمل تھی جس میں صرف یہ فرمایا گیا تھا کہ:

"پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔"

یہ نزولِ وحی کا پہلا تجربہ تھا جو اچانک حضورؐ کو پیش آیا تھا۔ اِس پیغام میں آپ کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ آپ کس کارِ عظیم پر مامور ہوئے ہیں اور آگے کیا کچھ آپ کو کرنا ہے، بلکہ صرف ایک ابتدائی تعارف کرا کے آپ کو کچھ مدت کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ آپ کی طبیعت پر جو شدید بار اِس پہلے تجربے سے پڑا ہے اس کا اثر دور ہو جائے اور آپ ذہنی طور پر آئندہ وحی

وصول کرنے اور نبوت کے فرائض سنبھالنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس وقفہ کے بعد جب دوبارہ نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہُوا تو اِس سُورہ کی ابتدائی سات آیتیں نازل کی گئیں اور ان میں پہلی مرتبہ آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ اٹھیں اور خلقِ خدا کو اُس روش کے انجام سے ڈرائیں جس پر وہ چل رہی ہے، اور اِس دنیا میں، جہاں دوسروں کی بڑائی کے ڈنکے بج رہے ہیں، خدا کی بڑائی کا اعلان کریں۔ اس کے ساتھ آپ کو ہدایت فرمائی گئی کہ اب جو کام آپ کو کرنا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی زندگی ہر لحاظ سے انتہائی پاکیزہ ہو اور آپ تمام دنیوی فائدوں سے قطع نظر کر کے کامل اخلاص کے ساتھ خلقِ خدا کی اصلاح کا فریضہ انجام دیں۔ پھر آخری فقرے میں آپ کو تلقین کی گئی کہ اِس فریضہ کی انجام دہی میں جو مشکلات اور مصائب بھی پیش آئیں ان پر آپ اپنے رب کی خاطر صبر کریں۔

اِس فرمانِ الٰہی کی تعمیل میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی اور قرآن مجید کی پے در پے نازل ہونے والی سورتوں کو آپ نے سنانا شروع کیا تو مکہ میں کھلبلی مچ گئی اور مخالفتوں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہُوا۔ چند مہینے اِس حال پر گزرے تھے کہ حج کا زمانہ آگیا اور مکہ کے لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اِس موقع پر تمام عرب سے حاجیوں کے قافلے آئیں گے، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن قافلوں کی قیام گاہوں پر جا جا کر آنے والے حاجیوں سے ملاقاتیں کیں اور حج کے اجتماعات میں جگہ جگہ کھڑے ہو کر قرآن جیسا بے نظیر اور مؤثر کلام سنانا شروع کر دیا، تو عرب کے ہر گوشے تک ان کی دعوت پہنچ جائے گی اور نہ معلوم کون کون اِس سے متاثر ہو جائے۔ اس لیے قریش کے سرداروں نے ایک کانفرنس کی جس میں طے کیا گیا کہ حاجیوں کے آتے ہی ان کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ اِس پر اتفاق ہو جانے کے بعد ولید بن مُغیرہ نے حاضرین سے کہا کہ اگر آپ لوگوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق مختلف باتیں لوگوں سے کہیں تو ہم سب کا اعتبار جاتا رہے گا۔ اس لیے کوئی ایک بات طے کر لیجیے جسے سب بالاتفاق کہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہم محمد (صلی اللہ

علیہ وسلم) کو کاہن کہیں گے۔ ولید نے کہا نہیں، خدا کی قسم وہ کاہن نہیں ہیں، ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے، جیسی باتیں وہ گنگناتے ہیں اور جس طرح کے فقرے وہ جوڑتے ہیں، قرآن کو ان سے کوئی دُور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ کچھ اور لوگ بولے، انہیں مجنون کہا جائے۔ ولید نے کہا وہ مجنون بھی نہیں ہیں۔ ہم نے دیوانے اور پاگل دیکھے ہیں۔ اس حالت میں آدمی جیسی بہکی بہکی باتیں اور الٹی سیدھی حرکات کرتا ہے وہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ کون باور کرے گا کہ محمدؐ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ دیوانگی کی بڑ ہے یا جنون کے دورے میں آدمی یہ باتیں کر سکتا ہے؟ لوگوں نے کہا اچھا تو پھر ہم شاعر کہیں گے۔ ولید نے کہا، وہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ ہم شعر کی ساری اقسام سے واقف ہیں۔ اس کلام پر شاعری کی کسی قسم کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔ لوگ بولے، تو ان کو ساحر کہا جائے۔ ولید نے کہا وہ ساحر بھی نہیں ہیں۔ جادوگروں کو ہم جانتے ہیں اور اپنے جادو کے لیے جو طریقے وہ اختیار کرتے ہیں ان سے بھی ہم واقف ہیں۔ یہ بات بھی محمدؐ پر چسپاں نہیں ہوتی۔ پھر ولید نے کہا ان باتوں میں سے جو بات بھی تم کرو گے لوگ اس کو ناروا الزام سمجھیں گے۔ خدا کی قسم اس کلام میں بڑی حلاوت ہے، اس کی جڑ بڑی گہری اور اس کی ڈالیاں بڑی ثمردار ہیں۔ اس پر ابوجہل ولید کے سر ہو گیا اور اس نے کہا تمہاری قوم تم سے راضی نہ ہو گی جب تک تم محمدؐ کے بارے میں کوئی بات نہ کہو۔ اس نے کہا اچھا مجھے سوچ لینے دو۔ پھر سوچ سوچ کر بولا قریب ترین بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ تم عرب کے لوگوں سے کہو یہ شخص جادوگر ہے، یہ ایسا کلام پیش کر رہا ہے جو آدمی کو اُس کے باپ، بھائی، بیوی بچوں اور سارے خاندان سے جدا کر دیتا ہے۔ ولید کی اس بات کو سب نے قبول کر لیا۔ پھر ایک منصوبے کے مطابق حج کے زمانے میں قریش کے وفود حاجیوں کے درمیان پھیل گئے اور انہوں نے آنے والے زائرین کو خبردار کرنا شروع کیا کہ یہاں ایک ایسا شخص اُٹھ کھڑا ہُوا ہے جو بڑا جادوگر ہے اور اس کا جادو خاندانوں میں تفرقہ ڈال دیتا ہے، اس سے ہوشیار رہنا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خود ہی سارے عرب میں مشہور کر دیا (سیرۃ ابن ہشام، جلد اوّل، صفحہ ۲۸۸-۲۸۹)۔ اِس قصے کا یہ حصہ کہ ابوجہل

کے اصرار پر ولید نے یہ بات کہی تھی عکرمہ کی روایت سے ابن جریر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے)۔

یہی واقعہ ہے جس پر اس سورہ کے دوسرے حصہ میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کے مضامین کی ترتیب یہ ہے:

آیت ۸ سے ۔آنک منکرین حق کو خبردار کیا گیا ہے کہ آج جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کا بُرا انجام وہ قیامت کے روز دیکھ لیں گے۔

آیت ۱۱ سے ۲۶ تک ولید بن مغیرہ کا نام لیے بغیر یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو کیا کچھ نعمتیں دی تھیں اور ان کا جواب اس نے کیسی حق دشمنی کے ساتھ دیا ہے۔ اس سلسلے میں اس کی ذہنی کشمکش کی پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے کہ ایک طرف دل میں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی صداقت کا قائل ہو چکا تھا، مگر دوسری طرف اپنی قوم میں اپنی ریاست و وجاہت کو بھی خطرے میں نہ ڈالنا چاہتا تھا، اس لیے نہ صرف یہ کہ وہ ایمان لانے سے باز رہا، بلکہ کافی دیر تک اپنے ضمیر سے لڑنے جھگڑنے کے بعد آخرکار یہ بات بنا کر لایا کہ خلق خدا کو اس کلام پر ایمان لانے سے باز رکھنے کے لیے اسے جادو قرار دینا چاہیے۔ اُس کی اس صریح بدباطنی کو بے نقاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اپنے اس کرتوت کے بعد بھی یہ شخص چاہتا ہے کہ اسے مزید انعامات سے نوازا جائے، حالانکہ اب یہ انعام کا نہیں بلکہ دوزخ کا سزاوار ہو چکا ہے۔

اس کے بعد آیت ۲۷ سے ۴۸ تک دوزخ کی ہولناکیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس اخلاق اور کردار کے لوگ اس کے مستحق ہیں۔

پھر آیات ۴۹-۵۳ میں کفار کے مرض کی اصل جڑ بتا دی گئی ہے کہ وہ چونکہ آخرت سے بے خوف ہیں اور اسی دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اس لیے وہ قرآن سے اس طرح بھاگتے ہیں جیسے شیر سے ڈر کر جنگلی گدھے بھاگے جا رہے ہوں، اور ایمان لانے کے لیے طرح طرح کی غیر معقول شرطیں پیش کرتے ہیں، حالانکہ خواہ ان کی کوئی شرط بھی پوری کر دی جائے، انکارِ آخرت

کے ساتھ وہ ایمان کی راہ پر ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتے۔

آخر میں صاف صاف فرما دیا گیا ہے کہ خدا کو کسی کے ایمان کی کوئی ضرورت نہیں پڑ گئی ہے کہ وہ اس کی شرطیں پوری کرتا پھرے۔ قرآن ایک عام نصیحت ہے جو سب کے سامنے پیش کر دی گئی ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس کو قبول کر لے۔ خدا اِس کا مستحق ہے کہ لوگ اُس کی نافرمانی سے ڈریں، اور اسی کی یہ شان ہے کہ جو شخص بھی تقویٰ اور خدا ترسی کا رویہ اختیار کرلے اسے وہ معاف کر دیتا ہے خواہ وہ پہلے کتنی ہی نافرمانیاں کر چکا ہو۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

اَے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے[1]، اٹھو اور خبردار کرو[2]۔ اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو[3]۔

---

[1] اوپر دیباچے میں ہم ان آیات کے نزول کا جو پس منظر بیان کر آئے ہیں اس پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو یاایّھا الرسول یا یا ایھا النبی کہہ کر مخاطب کرنے کے بجائے یاایّھا المدثر کہہ کر کیوں مخاطب کیا گیا ہے۔ چونکہ حضور یکایک جبریل علیہ السّلام کو آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھے دیکھ کر ہیبت زدہ ہو گئے تھے اور اسی حالت میں گھر پہنچ کر آپ نے اپنے اہل خانہ سے فرمایا تھا کہ مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو یا ایھا المدثر کہہ کر خطاب فرمایا۔ اِس لطیف طرزِ خطاب سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اَے میرے پیارے بندے، تم اوڑھ لپیٹ کر لیٹ کہاں گئے، تم پر تو ایک کارِ عظیم کا بار ڈالا گیا ہے جسے انجام دینے کے لیے تمہیں پُورے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔

[2] یہ اُسی نوعیت کا حکم ہے جو حضرت نوح علیہ السّلام کو نبوت کے منصب پر مامور کرتے ہوئے دیا گیا تھا کہ اَنۡذِرۡ قَوۡمَكَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ "اپنی قوم کے لوگوں کو ڈراؤ قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آجائے" (نوح۔۱)۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اَے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور تمہارے گرد وپیش خدا کے جو بندے خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اُن کو چونکا دو۔

اور اپنے کپڑے پاک رکھو[۴] اور گندگی سے دُور رہو[۵] اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے[۶] اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو[۷]۔

انہیں اُس انجام سے ڈراؤ جس سے یقیناً وہ دوچار ہونگے اگر اسی حالت میں مبتلا رہے۔ انہیں خبردار کردو کہ وہ کسی اندھیر نگری میں نہیں رہتے ہیں جس میں وہ اپنی مرضی سے جو کچھ چاہیں کرتے رہیں اور ان کے کسی عمل کی کوئی باز پرس نہ ہو۔

[۳] یہ ایک نبی کا اولین کام ہے جسے اِس دنیا میں اُسے انجام دینا ہوتا ہے۔ اُس کا پہلا کام ہی یہ ہے کہ جاہل انسان یہاں جن جن کی بڑائی مان رہے ہیں اُن سب کی نفی کردے اور ہانکے پکارے دنیا بھر میں یہ اعلان کردے کہ اِس کائنات میں بڑائی ایک خدا کے سوا اور کسی کی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں کلمۂ اللہ اکبر کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اذان کی ابتدا ہی اللہ اکبر کے اعلان سے ہوتی ہے۔ نماز میں بھی مسلمان تکبیر کے الفاظ کہہ کر داخل ہوتا ہے اور بار بار اللہ اکبر کہہ کر اٹھتا اور بیٹھتا ہے۔ جانور کے گلے پر چھری بھی پھیرتا ہے تو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر پھیرتا ہے۔ نعرۂ تکبیر آج ساری دنیا میں مسلمان کا سب سے زیادہ نمایاں امتیازی شعار ہے کیونکہ اس امت کے نبیؐ نے اپنا کام ہی اللہ کی تکبیر سے شروع کیا تھا۔

اس مقام پر ایک اور لطیف نکتہ بھی ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ جیسا کہ اِن آیات کی شانِ نزول سے معلوم ہو چکا ہے، یہ پہلا موقع تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوّت کا عظیم الشان فریضہ انجام دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور ظاہر تھی کہ جس شہر اور معاشرے میں یہ مشن لے کر اٹھنے کا آپ کو حکم دیا جا رہا تھا وہ شرک کا گڑھ تھا۔ بات صرف اتنی ہی نہ تھی کہ وہاں کے لوگ عام عربوں کی طرح مشرک تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ مکہ معظمہ مشرکین عرب کا سب سے بڑا تیرتھ بنا ہوا تھا اور قریش کے لوگ اُس کے مجاور تھے۔ ایسی جگہ کسی شخص کا تن تنہا اٹھنا اور شرک کے مقابلے میں توحید کا علم بلند کر دینا بڑے جان جوکھوں کا کام تھا۔ اسی لیے "اٹھو اور خبردار کرو" کے بعد فوراً ہی یہ فرمانا کہ "اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو" اپنے اندر یہ مفہوم بھی رکھتا ہے کہ جو بڑی بڑی ہولناک طاقتیں اِس کام میں تمہیں فراہم نظر آتی ہیں ان کی ذرا پروا نہ کرو اور صاف صاف کہہ دو کہ میرا رب اُن سب سے زیادہ بڑا ہے جو میری

اس دعوت کا راستہ روکنے کے لیے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ بڑی سے بڑی ہمت افزائی ہے جو اللہ کا کام شروع کرنے والے کسی شخص کی کی جا سکتی ہے۔ اللہ کی کبریائی کا نقش جس آدمی کے دل پر گہرا جما ہوا ہو وہ اللہ کی خاطر اکیلا ساری دنیا سے لڑ جانے میں بھی ذرہ برابر ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے گا۔

ہے یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جن کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔

ان کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھو، کیونکہ جسم و لباس کی پاکیزگی اور روح کی پاکیزگی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک پاکیزہ روح گندے جسم اور ناپاک لباس میں نہیں رہ سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس معاشرے میں اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے وہ صرف عقائد اور اخلاق کی خرابیوں ہی میں مبتلا نہ تھا بلکہ طہارت و نظافت کے بھی ابتدائی تصورات تک سے خالی تھا، اور حضورؐ کا کام ان لوگوں کو ہر لحاظ سے پاکیزگی کا سبق سکھانا تھا۔ اس لیے آپ کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپ اپنی ظاہری زندگی میں بھی طہارت کا ایک اعلیٰ معیار قائم فرمائیں۔ چنانچہ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ حضورؐ نے نوعِ انسانی کو طہارتِ جسم و لباس کی وہ مفصل تعلیم دی ہے جو زمانۂ جاہلیت کے اہلِ عرب تو درکنار، آج اس زمانے کی مہذب ترین قوموں کو بھی نصیب نہیں ہے، حتیٰ کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ایسا کوئی لفظ تک نہیں پایا جاتا جو "طہارت" کا ہم معنی ہو۔ بخلاف اس کے اسلام کا حال یہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اسلامی احکام کا آغاز ہی کتاب الطہارت سے ہوتا ہے جس میں پاکی اور ناپاکی کے فرق اور پاکیزگی کے طریقوں کو انتہائی تفصیلی جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا مفہوم ان الفاظ کا یہ ہے کہ اپنا لباس صاف ستھرا رکھو۔ راہبانہ تصورات نے دنیا میں مذہبیت کا معیار یہ قرار دے رکھا تھا کہ آدمی جتنا زیادہ میلا کچیلا ہو اتنا ہی زیادہ وہ مقدس ہوتا ہے۔ اگر کوئی ذرا اُجلے کپڑے ہی پہن لیتا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ دنیا دار انسان ہے۔ حالانکہ انسانی فطرت میل کچیل سے نفرت کرتی ہے اور شائستگی کی معمولی حس بھی جس شخص کے اندر موجود ہو وہ صاف ستھرے انسان ہی سے مانوس ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی کہ اس کی ظاہری حالت بھی ایسی پاکیزہ اور نفیس ہونی چاہیے کہ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور اس کی

شخصیت میں کوئی ایسی کثافت نہ پائی جائے جو طبائع کو اس سے تنفر کرنے والی ہو۔

تیسرا مفہوم اِس ارشاد کا یہ ہے کہ اپنے لباس کو اخلاقی عیوب سے پاک رکھو تمہارا لباس سُتھرا اور پاکیزہ تو ضرور ہو، مگر اس میں فخر و غرور، ریا اور نمائش، ٹھاٹھ باٹھ اور شان و شوکت کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیے۔ لباس وہ اوّلین چیز ہے جو آدمی کی شخصیت کا تعارف لوگوں سے کراتی ہے۔ جس قسم کا لباس کوئی شخص پہنتا ہے اس کو دیکھ کر لوگ پہلی نگاہ ہی میں یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ رئیسوں اور نوابوں کے لباس، مذہبی پیشہ وروں کے لباس، متکبر اور برخود غلط لوگوں کے لباس، چھچورے اور کم ظرف لوگوں کے لباس، بدقوارہ اور آوارہ منش لوگوں کے لباس، سب اپنے پہننے والوں کے مزاج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف بلانے والے کا مزاج ایسے سب لوگوں سے فطرۃً مختلف ہوتا ہے، اس لیے اس کا لباس بھی ان سب سے لازماً مختلف ہونا چاہیے۔ اس کو ایسا لباس پہننا چاہیے جسے دیکھ کر ہر شخص یہ محسوس کرے کہ وہ ایک شریف اور شائستہ انسان ہے جو نفس کی کسی بُرائی میں مبتلا نہیں ہے۔

چوتھا مفہوم اس کا یہ ہے کہ اپنا دامن پاک رکھو۔ اردو زبان کی طرح عربی زبان میں بھی پاک دامنی کے ہم معنی الفاظ اخلاقی برائیوں سے پاک ہونے اور عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ابن عباس، ابراہیم نَخَعی، شَعْبی، عطاء، مجاہد، قَتَادہ، سعید بن جُبَیر، حسن بصری اور دوسرے اکابر مفسرین نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ اپنے اخلاق پاکیزہ رکھو اور ہر قسم کی برائیوں سے بچو۔ عربی محاورے میں کہتے ہیں کہ فلان طاھر الثیاب و فلان طاھر الذیل "فلاں شخص کے کپڑے پاک ہیں یا اس کا دامن پاک ہے" اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے اخلاق اچھے ہیں۔ اس کے برعکس کہتے ہیں فلانٌ دَنِسُ الثیاب "اس شخص کے کپڑے گندے ہیں" اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بدمعاملہ آدمی ہے، اس کے قول قرار کا کوئی اعتبار نہیں۔

۵؎ گندگی سے مراد ہر قسم کی گندگی ہے خواہ وہ عقائد اور خیالات کی ہو، یا اخلاق و اعمال کی، یا جسم و لباس اور رہن سہن کی۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے گرد و پیش سارے معاشرے میں طرح طرح کی جو گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں ان سب سے اپنا دامن بچا کر رکھو۔ کوئی شخص کبھی تم پر یہ حرف نہ رکھ سکے کہ جن بُرائیوں سے

تم لوگوں کو روک رہے ہو ان میں سے کسی کا بھی کوئی شائبہ تمہاری اپنی زندگی میں پایا جاتا ہے۔

ؔ اصل الفاظ ہیں وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ۔ ان کے مفہوم میں اتنی وسعت ہے کہ کسی ایک فقرے میں ان کا ترجمہ کر کے پورا مطلب ادا نہیں کیا جا سکتا۔

ان کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جس پر بھی احسان کرو بے غرضانہ کرو۔ تمہاری عطا اور بخشش اور سخاوت اور حُسنِ سلوک محض اللہ کے لیے ہو، اس میں کوئی شائبہ اس خواہش کا نہ ہو کہ احسان کے بدلے میں تمہیں کسی قسم کے دنیوی فوائد حاصل ہوں۔ بالفاظِ دیگر اللہ کے لیے احسان کرو، فائدہ حاصل کرنے کے لیے کوئی احسان نہ کرو۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ نبوت کا جو کام تم کر رہے ہو یہ اگرچہ اپنی جگہ ایک بہت بڑا احسان ہے کہ تمہاری بدولت خلقِ خدا کو ہدایت نصیب ہو رہی ہے، مگر اس کا کوئی احسان لوگوں پر نہ جتاؤ اور اس کا کوئی فائدہ اپنی ذات کے لیے حاصل نہ کرو۔

تیسرا مفہوم یہ ہے کہ تم اگرچہ ایک بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہو، مگر اپنی نگاہ میں اپنے عمل کو کبھی بڑا عمل نہ سمجھو اور کبھی یہ خیال تمہارے دل میں نہ آئے کہ نبوت کا یہ فریضہ انجام دے کر، اور اس کام میں جان لڑا کر تم اپنے رب پر کوئی احسان کر رہے ہو۔

ؔ یعنی یہ کام جو تمہارے سپرد کیا جا رہا ہے، بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس میں سخت مصائب اور مشکلات اور تکلیفوں سے تمہیں سابقہ پیش آئے گا۔ تمہاری اپنی قوم تمہاری دشمن ہو جائے گی۔ سارا عرب تمہارے خلاف صف آرا ہو جائے گا۔ مگر جو کچھ بھی اس راہ میں پیش آئے، اپنے رب کی خاطر اس پر صبر کرنا اور اپنے فرض کو پوری ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ انجام دینا۔ اس سے باز رکھنے کے لیے خوف، طمع، لالچ، دوستی، دشمنی، محبت ہر چیز تمہارے راستے میں حائل ہو گی۔ ان سب کے مقابلے میں مضبوطی کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہنا۔

یہ تھیں وہ اوّلین ہدایات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو اُس وقت دی تھیں جب اُس نے آپ کو یہ حکم دیا تھا کہ آپ اٹھ کر نبوت کے کام کا آغاز فرما دیں۔ کوئی شخص اگر ان چھوٹے چھوٹے فقروں پر اور ان کے معانی پر غور کرے تو اس کا دل گواہی دے گا کہ ایک نبی کو نبوت کا کام شروع کرتے وقت اس سے

اچھا،[۸] جب صور میں پھونک ماری جائے گی، وہ دن بڑا ہی سخت دن ہوگا، کافروں کے لیے ہلکا نہ ہوگا۔[۹] چھوڑ دو مجھے اور اُس شخص[۱۰] کو جسے مَیں نے اکیلا پیدا کیا،[۱۱] بہت سا مال اُس کو دیا، اُس کے

بہتر کوئی ہدایات نہیں دی جا سکتی تھیں۔ ان میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ آپ کو کام کیا کرنا ہے، اور یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ اِس کام کے لیے آپ کی زندگی اور آپ کے اخلاق اور معاملات کیسے ہونے چاہییں، اور یہ تعلیم بھی دے دی گئی کہ یہ کام آپ کس نیت، کس ذہنیت اور کس طرزِ فکر کے ساتھ انجام دیں، اور اس بات سے بھی خبردار کر دیا گیا کہ اس کام میں آپ کو کن حالات سے سابقہ پیش آنا ہے اور ان کا مقابلہ آپ کو کس طرح کرنا ہوگا۔ آج جو لوگ تعصب میں اندھے ہو کر یہ کہتے ہیں کہ معاذ اللہ صَرع کے دَوروں میں یہ کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری ہو جایا کرتا تھا وہ ذرا آنکھیں کھول کر اِن فقروں کو دیکھیں اور خود سوچیں کہ یہ صَرع کے کسی دَورے میں نکلے ہوئے الفاظ ہیں یا ایک خدا کی ہدایات ہیں جو رسالت کے کام پر مامور کرتے ہوئے وہ اپنے بندے کو دے رہا ہے؟

۸ جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر آئے ہیں، اِس سُورہ کا یہ حصّہ ابتدائی آیات کے چند مہینے بعد اُس وقت نازل ہُوا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عَلانیہ تبلیغِ اسلام شروع ہو جانے کے بعد پہلی مرتبہ حج کا زمانہ آیا اور سردارانِ قریش نے ایک کانفرنس کر کے یہ طے کیا کہ مکّہ میں باہر سے آنے والے حاجیوں کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرنے کے لیے پروپیگنڈا کی ایک زبردست مہم چلائی جائے۔ اِن آیات میں کفار کی اِسی کارروائی پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اِس تبصرے کا آغاز اِن الفاظ سے کیا گیا ہے جن کا مطلب یہ ہے کہ اچھا، یہ حرکتیں جو تم کرنا چاہتے ہو کر لو، دنیا میں اِن سے کوئی مقصد براری تم نے کر بھی لی تو اُس روز اپنے بُرے انجام سے کیسے بچ نکلو گے جب صور میں پھونک ماری جائے گی اور قیامت برپا ہوگی۔ صور کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حاشیہ ۴۷۔ جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۵۷۔ جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۷۸۔ الحج، حاشیہ ۱۔ جلد چہارم، یٰس، حواشی ۴۶ - ۴۷۔ الزُّمر، حاشیہ ۷۹۔ جلد پنجم، قٓ، حاشیہ ۵۲۔

۹ اِس ارشاد سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ دن ایمان لانے والوں کے لیے ہلکا ہوگا اور اس کی سختی صرف حق کا انکار کرنے والوں کے لیے مخصوص ہوگی۔ مزید براں یہ ارشاد اپنے اندر یہ مفہوم بھی رکھتا ہے

ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے دیئے[۱۲]، اور اس کے لیے ریاست کی راہ ہموار کی، پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ مَیں اسے اور زیادہ دوں[۱۳]۔ ہرگز نہیں، وہ ہماری آیات سے عناد رکھتا ہے۔ مَیں تو اسے

کہ اُس دن کی سختی کافروں کے لیے مستقل سختی ہو گی، وہ ایسی سختی نہ ہو گی جس کے بعد کبھی اس کے نرمی سے بدل جانے کی امید کی جا سکتی ہو۔

۱۰؎ یہ خطاب ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی، کفّار کی اِس کانفرنس میں جس شخص (ولید بن مُغیرہ) نے تمہیں بدنام کرنے کے لیے یہ مشورہ دیا ہے کہ تمام عرب سے آنے والے حاجیوں میں تمہیں جادوگر مشہور کیا جائے، اُس کا معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اُس سے نمٹنا اب میرا کام ہے، تمہیں اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۱۱؎ اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ جب مَیں نے اُسے پیدا کیا تھا اُس وقت یہ کوئی مال اور اولاد اور وجاہت اور ریاست لے کر پیدا نہیں ہُوا تھا۔ دوسرا یہ کہ اُس کا پیدا کرنے والا اکیلا مَیں ہی تھا، وہ دوسرے معبود، جن کی خدائی قائم رکھنے کے لیے یہ تمہاری دعوتِ توحید کی مخالفت میں اس قدر سرگرم ہے، اُس کو پیدا کرنے میں میرے ساتھ شریک نہ تھے۔

۱۲؎ ولید بن مغیرہ کے دس بارہ لڑکے تھے جن میں سے حضرت خالد بن ولید تاریخ میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ اِن بیٹوں کے لیے شُہُود کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو کہیں اپنی روزی کے لیے دوڑ دھوپ اور سفر کرنے کی حاجت پیش نہیں آتی، ان کے گھر کھانے کو اتنا موجود ہے کہ ہر وقت باپ کے پاس موجود اور اس کی مدد کے لیے حاضر رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کے سب بیٹے نامور اور با اثر ہیں، مجلسوں اور محفلوں میں اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ اِس مرتبے کے لوگ ہیں کہ معاملات میں ان کی شہادت قبول کی جاتی ہے۔

۱۳؎ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اِس پر بھی اس کی حرص ختم نہیں ہوتی۔ اتنا کچھ پانے کے بعد بھی وہ بس اسی فکر میں لگا ہُوا ہے کہ اسے دنیا بھر کی نعمتیں عطا کر دی جائیں۔ دوسرا مطلب حضرت حسن بصری اور بعض دوسرے بزرگوں نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر واقعی محمدؐ کا یہ بیان سچا ہے کہ مرنے کے

عنقریب ایک کٹھن چڑھائی چڑھواؤں گا۔ اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی تو خدا کی مار اس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ ہاں، خدا کی مار اس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا۔ پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا۔ پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا۔ آخر کار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آرہا ہے، یہ تو ایک انسانی کلام ہے[۱۴]۔ عنقریب میں اسے دوزخ میں جھونک دوں گا۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دوزخ؟ نہ باقی رکھے نہ چھوڑے[۱۵]۔ کھال جھلس دینے والی[۱۶]۔ انیس کارکن اس پر مقرر ہیں ——— ہم[۱۷] نے دوزخ کے یہ کارکن فرشتے

بعد کوئی دوسری زندگی ہے اور اس میں کوئی جنت بھی ہوگی تو وہ جنت میرے ہی لیے بنائی گئی ہے۔

[۱۴] یہ اُس واقعہ کا ذکر ہے جو کفار مکہ کی مذکورۂ بالا کانفرنس میں پیش آیا تھا۔ اس کی جو تفصیلات ہم دیباچے میں نقل کر چکے ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ شخص دل میں قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا قائل ہو چکا تھا، لیکن اپنی قوم میں محض اپنی وجاہت و ریاست برقرار رکھنے کے لیے ایمان لانے پر تیار نہ تھا۔ جب کفار کی اس کانفرنس میں پہلے اس نے خود ان تمام الزامات کو رد کر دیا جو قریش کے سردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لگا رہے تھے تو اسے مجبور کیا گیا کہ وہ خود کوئی ایسا الزام تراشے جسے عرب کے لوگوں میں پھیلا کر حضورؐ کو بدنام کیا جا سکتا ہو۔ اس موقع پر جس طرح وہ اپنے ضمیر سے لڑا ہے اور جس شدید ذہنی کشمکش میں کافی دیر تلملا رہ کر آخر کار اس نے ایک الزام گھڑا ہے اس کی پوری تصویر یہاں کھینچ دی گئی ہے۔

[۱۵] اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو شخص بھی اس میں ڈالا جائے گا اسے وہ جلا کر خاک کر دے گی مگر مر کر بھی اس کا پیچھا نہ چھوٹے گا بلکہ وہ پھر زندہ کیا جائے گا اور پھر جلایا جائے گا۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی ”وہ نہ اس میں مرے گا نہ جیے گا“ (الاعلیٰ-۱۳)۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ عذاب کے مستحقین میں سے کسی کو باقی نہ رہنے دیگی جو اس کی گرفت میں آئے بغیر رہ جائے، اور جو بھی اس کی گرفت میں آئے گا اسے عذاب دیئے بغیر نہ چھوڑے گی۔

[۱۶] یہ کہنے کے بعد کہ وہ جسم میں سے کچھ جلائے بغیر نہ چھوڑے گی، کھال جھلس دینے کا الگ ذکر کرنا

بنائے ہیں،[18] اور ان کی تعداد کو کافروں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے،[19] تاکہ اہل کتاب کو یقین آجائے[20]

بظاہر کچھ غیر ضروری سا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن عذاب کی اس شکل کو خاص طور پر الگ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ آدمی کی شخصیت کو نمایاں کرنے والی چیز دراصل اس کے چہرے اور جسم کی کھال ہی ہوتی ہے جس کی بدنمائی اُسے سب سے زیادہ کھلتی ہے۔ اندرونی اعضاء میں خواہ اسے کتنی ہی تکلیف ہو، وہ اس پر اتنا زیادہ رنجیدہ نہیں ہوتا جتنا اس بات پر رنجیدہ ہوتا ہے کہ اس کا منہ بدنما ہو جائے، یا اس کے جسم کے کھلے حصّوں کی جلد پر ایسے داغ پڑ جائیں جنہیں دیکھ کر ہر شخص اُس سے گِھن کھانے لگے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ یہ حسین چہرے اور بڑے بڑے شاندار جسم لیے ہوئے جو لوگ آج دنیا میں اپنی شخصیت پر پھولے پھر رہے ہیں، یہ اگر اللہ کی آیات کے ساتھ عناد کی وہ روش برتیں گے جو ولید بن مغیرہ برت رہا ہے تو ان کے منہ جُھلس دیے جائیں گے اور ان کی کھال جلا کر کوئلے کی طرح سیاہ کر دی جائے گی۔

[17] یہاں سے لے کر "تیرے رب کے لشکروں کو خود اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا ۳۱" تک کی پوری عبارت ایک جملۂ معترضہ ہے جو دورانِ تقریر میں سلسلۂ کلام کو توڑ کر اُن معترضین کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ سن کر کہ دوزخ کے کارکنوں کی تعداد صرف ۱۹ ہوگی، اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا۔ ان کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ ایک طرف تو ہم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ آدم علیہ السلام کے وقت سے لے کر قیامت تک دنیا میں جتنے انسانوں نے بھی کفر اور کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا ہے وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے، اور دوسری طرف ہمیں یہ خبر دی جا رہی ہے کہ اتنی بڑی دوزخ میں اتنے بے شمار انسانوں کو عذاب دینے کے لیے صرف ۱۹ کارکن مقرر ہونگے۔ اس پر قریش کے سرداروں نے بڑے زور کا ٹھٹھا مارا۔ ابوجہل بولا "بھائیو، کیا تم اتنے گئے گزرے ہو کہ تم میں سے دس دس آدمی مل کر بھی دوزخ کے ایک ایک سپاہی سے نمٹ نہ لیں گے؟" بنی جُمَح کے ایک پہلوان صاحب کہنے لگے "، اسے تو میں اکیلا نمٹ لونگا، باقی دو کو تم سب مل کر سنبھال لینا"۔ انہی باتوں کے جواب میں یہ فقرے بطور جملۂ معترضہ ارشاد ہوئے ہیں۔

[18] یعنی اُن کی قوتوں کو انسانی قوتوں پر قیاس کرنا تمہاری حماقت ہے۔ وہ آدمی نہیں، فرشتے ہونگے

اور تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی کیسی زبردست طاقتوں کے فرشتے پیدا کیے ہیں۔

ف۱ یعنی بظاہر تو اس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ دوزخ کے کارکنوں کی تعداد بیان کی جاتی لیکن ہم نے ان کی یہ تعداد اس لیے بیان کر دی ہے کہ یہ ہر اُس شخص کے لیے فتنہ بن جائے جو اپنے اندر کوئی کفر چھپائے بیٹھا ہو۔ ایسا آدمی چاہے ایمان کی کتنی ہی نمائش کر رہا ہو، اگر وہ خدا کی خدائی اور اس کی عظیم قدرتوں کے بارے میں، یا وحی و رسالت کے بارے میں شک کا کوئی شائبہ بھی اپنے دل کے کسی گوشے میں لیے بیٹھا ہو تو یہ سنتے ہی کہ خدا کی اتنی بڑی جیل میں بے حد و حساب جن اور انسان مجرموں کو صرف ۱۹ سپاہی قابو میں بھی رکھیں گے اور فرداً فرداً ایک ایک شخص کو عذاب بھی دیں گے تو اس کا کفر فوراً کھل کر باہر آجائے گا۔

ف۲ بعض مفسرین نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے ہاں چونکہ ان کی اپنی کتابوں میں بھی دوزخ کے فرشتوں کی یہی تعداد بیان کی گئی ہے، اس لیے یہ بات سن کر ان کو یقین آجائے گا کہ یہ بات فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی کی فرمائی ہوئی ہے۔ لیکن یہ تفسیر ہمارے نزدیک دو وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔ اوّل یہ کہ یہود و نصاریٰ کی جو مذہبی کتابیں دنیا میں پائی جاتی ہیں ان میں تلاش کے باوجود ہمیں یہ بات کہیں نہیں ملی کہ دوزخ کے فرشتوں کی تعداد ۱۹ ہے۔ دوسرے، قرآن مجید میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جو اہلِ کتاب کے ہاں ان کی مذہبی کتابوں میں بھی بیان کی گئی ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اس کی یہ توجیہ کر دیتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں ان کی کتابوں سے نقل کر لی ہیں۔ ان وجوہ سے ہمارے نزدیک اس ارشاد کا صحیح مطلب یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میری زبان سے دوزخ کے ۱۹ فرشتوں کا ذکر سن کر میرا خوب مذاق اڑایا جائے گا، لیکن اس کے باوجود جو بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی وحی میں بیان ہوئی تھی اسے انہوں نے کسی خوف اور جھجک کے بغیر علی الاعلان لوگوں کے سامنے پیش کر دیا اور کسی کے مذاق و استہزاء کی ذرہ برابر پروا نہ کی۔ جہلائے عرب تو انبیاء کی شان سے ناواقف تھے، مگر اہلِ کتاب خوب جانتے تھے کہ انبیاء کا ہر زمانے میں یہی طریقہ رہا ہے کہ جو کچھ خدا کی طرف سے آتا تھا اسے وہ جوں کا توں لوگوں تک پہنچا دیتے تھے خواہ

اور ایمان لانے والوں کا ایمان بڑھے[۲۱]، اور اہلِ کتاب اور مومنین کسی شک میں نہ رہیں اور دل کے بیمار[۲۲]

وہ لوگوں کو پسند ہو یا ناپسند۔ اس بنا پر اہلِ کتاب سے یہ بات زیادہ متوقع تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس طرزِ عمل کو دیکھ کر انہیں یقین آجائے گا کہ ایسے سخت مخالف ماحول میں ایسی بظاہر انتہائی عجیب بات کو کسی جھجک کے بغیر پیش کر دینا ایک نبی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ طرزِ عمل بارہا ظاہر ہوا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال معراج کا واقعہ ہے جسے آپؐ نے کفار کے مجمع عام میں بلا تکلف بیان کر دیا اور اس بات کی ذرہ برابر پروا نہ کی کہ اس حیرت انگیز قصے کو سُن کر آپ کے مخالفین کیسی کیسی باتیں بنائیں گے۔

۲۱؎ یہ بات اس سے پہلے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہو چکی ہے کہ ہر آزمائش کے موقع پر جب ایک مومن اپنے ایمان پر ثابت قدم رہتا ہے اور شک و انکار یا اطاعت سے فرار یا دین سے بے وفائی کی راہ چھوڑ کر یقین و اعتماد اور اطاعت و فرمانبرداری اور دین سے وفاداری کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس کے ایمان کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، آلِ عمران، آیت ۱۷۳۔ جلد دوم، الانفال، آیت ۲، حاشیہ ۲۔ التوبہ، آیات ۱۲۴-۱۲۵۔ حاشیہ ۱۲۵۔ جلد چہارم، الاحزاب، آیت ۲۲، حاشیہ ۳۸۔ جلد پنجم، الفتح، آیت ۴، حاشیہ ۷)۔

۲۲؎ قرآن مجید میں چونکہ بالعموم "دل کی بیماری" سے مراد منافقت لی جاتی ہے، اس لیے یہاں اس لفظ کو دیکھ کر بعض مفسرین نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے کیونکہ منافقین کا ظہور مدینہ ہی میں ہوا ہے۔ لیکن یہ خیال کئی وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔ اول تو یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ مکہ میں منافق موجود نہ تھے، اور اس کی غلطی ہم تفہیم القرآن جلد سوم میں صفحہ ۶۷۲، ۶۷۴، اور ۶۸۰ تا ۶۸۲ پر واضح کر چکے ہیں۔ دوسرے یہ طرزِ تفسیر ہمارے نزدیک درست نہیں ہے کہ ایک سلسلۂ کلام جو ایک خاص موقع پر خاص حالات میں ارشاد ہوا ہو، اس کے اندر یکایک کسی ایک فقرے کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے موقع پر نازل ہوا تھا اور یہاں لا کر کسی مناسبت کے بغیر شامل کر دیا گیا۔ سورۂ مدثر کے اس حصے کا تاریخی پس منظر ہمیں معتبر روایات سے معلوم ہے۔ یہ ابتدائی مکی دور کے

اور کفار یہ کہیں کہ بھلا اللہ کا اس عجیب بات سے کیا مطلب ہو سکتا ہے [۲۳]۔ اِس طرح اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت بخش دیتا ہے [۲۴]۔ اور تیرے رب کے لشکروں کو خود

ایک خاص واقعہ کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ اُس کا پورا سلسلۂ کلام اس واقعہ کے ساتھ صریح مناسبت رکھتا ہے۔ اِس مضمون میں آخر کونسا موقع تھا کہ اس ایک فقرے کو، اگر وہ کئی سال بعد مدینہ میں نازل ہُوا تھا، اِس جگہ لا کر چسپاں کر دیا جاتا؟ اب رہا یہ سوال کہ یہاں دل کی بیماری سے مراد کیا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد شک کی بیماری ہے۔ مکّہ میں ہی نہیں، دنیا بھر میں پہلے بھی اور آج بھی کم لوگ ایسے تھے اور ہیں جو قطعیت کے ساتھ خدا، آخرت، وحی، رسالت، جنت، دوزخ وغیرہ کا انکار کرتے ہوں۔ اکثریت ہر زمانے میں انہی لوگوں کی رہی ہے جو اس شک میں مبتلا رہے ہیں کہ معلوم نہیں خدا ہے یا نہیں، آخرت ہو گی یا نہیں، فرشتوں اور جنت اور دوزخ کا واقعی کوئی وجود ہے یا یہ محض افسانے ہیں، اور رسول واقعی رسول تھے اور ان پر وحی آتی تھی یا نہیں۔ یہی شک اکثر لوگوں کو کفر کے مقام پر کھینچ لے گیا ہے، ورنہ ایسے بے وقوف دنیا میں کبھی زیادہ نہیں رہے جنہوں نے بالکل قطعی طور پر اِن حقائق کا انکار کر دیا ہو، کیونکہ جس آدمی میں ذرّہ برابر بھی عقل کا مادّہ موجود ہے وہ یہ جانتا ہے کہ اِن امُور کے صحیح ہونے کا امکان بالکل رد کر دینے اور انہیں قطعاً خارج از امکان قرار دینے کے لیے ہرگز کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔

۲۳؎ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اِسے اللہ کا کلام تو مان رہے تھے مگر تعجب اس بات پر ظاہر کر رہے تھے کہ اللہ نے یہ بات کیوں فرمائی۔ بلکہ دراصل وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ جس کلام میں ایسی بعید از عقل و فہم بات کہی گئی ہے وہ بھلا اللہ کا کلام کیسے ہو سکتا ہے۔

۲۴؎ یعنی اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے کلام اور اپنے احکام و فرامین میں وقتاً فوقتاً ایسی باتیں ارشاد فرما دیتا ہے جو لوگوں کے لیے امتحان اور آزمائش کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ایک ہی بات ہوتی ہے جسے ایک راستی پسند، سلیم الطبع اور صحیح الفکر آدمی سنتا ہے اور سیدھے طریقے سے اس کا سیدھا مطلب سمجھ کر سیدھی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ اُسی بات کو ایک ہٹ دھرم، کج فہم اور راستی سے گریز کرنے والا آدمی سنتا ہے اور اُس کا ٹیڑھا مطلب نکال کر اسے حق سے دُور بھاگ جانے کے لیے ایک نیا بہانا بنا لیتا ہے۔ پہلا آدمی

اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا[25] — اور اس دوزخ کا ذکر اِس کے سوا کسی غرض کے لیے نہیں کیا گیا ہے کہ لوگوں کو اس سے نصیحت ہو[26]۔ ہرگز نہیں[27]، قسم ہے چاند کی، اور رات کی جبکہ وہ پلٹتی ہے، اور صبح کی جبکہ وہ روشن ہوتی ہے، یہ دوزخ بھی بڑی چیزوں میں سے ایک ہے[28]، انسانوں

چونکہ خود حق پسند ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اسے ہدایت بخش دیتا ہے، کیونکہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ ہدایت چاہنے والے کو زبردستی گمراہ کرے۔ اور دوسرا آدمی چونکہ خود ہدایت نہیں چاہتا بلکہ گمراہی کو ہی اپنے لیے پسند کرتا ہے اس لیے اللہ اسے ضلالت ہی کے راستوں پر دھکیل دیتا ہے، کیونکہ اللہ کا یہ طریقہ بھی نہیں ہے کہ جو حق سے نفرت رکھتا ہو وہ اسے جبراً کھینچ کر حق کی راہ پر لائے۔ (اللہ کے ہدایت دینے اور گمراہ کرنے کے مسئلے پر تفہیم القرآن میں بکثرت مقامات پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۱۰، ۱۶، ۱۹، ۲۰۔ النساء، حاشیہ ۱۷۳۔ الانعام، حواشی ۱۷، ۲۸، ۹۰۔ جلد دوم، یونس، حاشیہ ۱۳۔ جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۵۴۔ القصص، حاشیہ ۱۷)۔

[25] یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کائنات میں کیسی کیسی اور کتنی مخلوقات پیدا کر رکھی ہیں، اور ان کو کیا کیا طاقتیں اس نے بخشی ہیں، اور ان سے کیا کیا کام وہ لے رہا ہے، ان باتوں کو اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔ ایک چھوٹے سے کرۂ زمین پر رہنے والا انسان اپنی محدود نظر سے اپنے گرد و پیش کی چھوٹی سی دنیا کو دیکھ کر اگر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ خدا کی خدائی میں بس وہی کچھ ہے جو اسے اپنے حواس یا اپنے آلات کی مدد سے محسوس ہوتا ہے، تو یہ اس کی اپنی ہی نادانی ہے۔ ورنہ یہ خدائی کا کارخانہ اتنا وسیع و عظیم ہے کہ اس کی کسی ایک چیز کا بھی پورا علم حاصل کر لینا انسان کے بس میں نہیں ہے، کجا کہ اس کی ساری وسعتوں کا تصور اس کے چھوٹے سے دماغ میں سما سکے۔

[26] یعنی لوگ اپنے آپ کو اس کا مستحق بنانے اور اس کے عذاب کا مزا چکھنے سے پہلے ہوش میں آ جائیں اور اپنے آپ کو اس سے بچانے کی فکر کریں۔

[27] یعنی یہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے جس کا اِس طرح مذاق اڑایا جائے۔

[28] یعنی جس طرح چاند، اور رات اور دن اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عظیم نشانات ہیں اُسی طرح

کے لیے ڈراوا، تم میں سے ہر اُس شخص کے لیے ڈراوا جو آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے رہ جانا چاہے۔[29]

دوزخ بھی عظائمِ قدرت میں سے ایک چیز ہے۔ اگر چاند کا وجود غیر ممکن نہ تھا، اگر رات اور دن کا اس باقاعدگی کے ساتھ آنا غیر ممکن نہ تھا، تو دوزخ کا وجود، آخر کیوں تمہارے خیال میں غیر ممکن ہو گیا؟ ان چیزوں کو چونکہ تم رات دن دیکھ رہے ہو اس لیے تمہیں ان پر کوئی حیرت نہیں ہوتی، ورنہ اپنی ذات میں یہ بھی اللہ کی قدرت کے نہایت حیرت انگیز معجزے ہیں، جو اگر تمہارے مشاہدے میں نہ آئے ہوتے، اور کوئی تمہیں خبر دیتا کہ چاند جیسی ایک چیز بھی دنیا میں موجود ہے، یا سورج ایک چیز ہے جس کے چھپنے سے دنیا میں اندھیرا ہو جاتا ہے اور جس کے نکل آنے سے دنیا چمک اٹھتی ہے، تو تم جیسے لوگ اس بات کو سن کر بھی اسی طرح ٹھٹھے مارتے جس طرح دوزخ کا ذکر سن کر ٹھٹھے مار رہے ہو۔

[29] مطلب یہ ہے کہ اس چیز سے لوگوں کو ڈرا دیا گیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس سے ڈر کر بھلائی کے راستے پر آگے بڑھے اور جس کا جی چاہے پیچھے ہٹ جائے۔

اسلامی شریعت کے بنیادی ضابطے

حسن احمد الخطیب المصری - ترجمہ: خلیل حامدی

(۲)

دسواں ضابطہ: العادۃ محکمۃ (رواج پر حکم جاری کیا جائے گا)۔ اسی مفہوم کو یہ ضابطہ بھی ادا کرتا ہے کہ المعروف عرفاً کالمشروط شرطاً (عرفِ عام کے لحاظ سے جو چیز مروّج ہوتی ہے اُس کی وہی قانونی حیثیت ہوتی ہے جو صراحۃً کسی شرط کے ساتھ مشروط معاملہ کی ہوتی ہے)۔ اس ضابطے کی بنیاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ "ماراٰہ المسلمون حسناً فھو عند اللہ حسنٌ (مسلمان مجموعی طور پر جس چیز کو مستحسن سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی مستحسن ہے)۔ علامہ العلائی کہتے ہیں: مجھے اس حدیث کی مرفوع سند نہیں ملی بلکہ یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے۔ امام احمد اور دوسرے ائمہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں کو دیکھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو تمام بندوں کے دلوں سے بہتر پایا۔ اور انہیں اپنی رسالت کے لیے منتخب فرمایا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد دوبارہ بندوں کے قلوب پر نظر فرمائی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے دلوں کو تمام بندوں کے دلوں سے بہتر دیکھا۔ چنانچہ انہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لیے منتخب فرمایا۔ پس اہلِ ایمان جس چیز کو اچھا سمجھیں اللہ کے نزدیک بھی وہ اچھی ہے۔ اور جسے اہلِ ایمان قبیح سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی بُری ہے"[1]۔

اس ضابطے پر اہلِ فقہ نے بکثرت عمل کیا ہے۔ اور یہ ہمیشہ علماء اور فقہاء کی زبان پر جاری وساری رہا ہے۔ چنانچہ فقہاء اسی ضابطے کی روشنی میں یہ کہتے ہیں کہ "المعروف عرفاً کالمشروط شرطاً۔ امام

[1] الاشباہ والنظائر ص ۱۲۶ اور الطرق الحکمیہ ص ۹۱۔

سرخسی مبسوط میں فرماتے ہیں کہ "الثابت بالعرف کالثابت بالنص" (جو چیز عُرف سے ثابت ہے اُس کا وہی درجہ ہے جو صراحۃً طے شدہ بات سے ثابت شدہ چیز کا ہے) حنفی فقیہ علاّمہ محمد ابن جو ابن عابدین کے نام سے مشہور ہیں، نے ایک رسالہ تالیف کیا ہے جس کا نام انہوں نے رکھا ہے: نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف"۔ رسم المفتی میں ابن عابدین کا ایک منظوم قصیدہ ہے۔ اس قصیدے کا ایک شعر یہ ہے:

والعرف فی الشرع لہ اعتبار

لذا علیہ الحکم قد یدار

"شریعت میں عُرف کا لحاظ کیا جاتا ہے لہٰذا کبھی عرف پر بھی احکامِ شریعت کا دارومدار ہوتا ہے"۔

ابن عابدین کی مشہور کتاب ردّ المحتار کے پانچویں حصے میں لڑکے اور لڑکی کے سنِ بلوغ کی تحدید پر بحث کے دوران یہ مذکور ہے کہ جس معاملے میں کوئی نص وارد نہ ہو وہاں رواج ایک شرعی حجت ہوگا۔ شہاب الدین القرافی کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ "احکام عُرف اور رواج کے مطابق جاری ہوں گے۔ اور عُرف اور رواج کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ فقیہ کو بھی حکم تبدیل کرنا ہوگا۔ یہ مفتی کی جہالت ہے کہ وہ عُرف کی تبدیلی کی طرف التفات نہ کرے اور کتابوں میں لکھے ہوئے الفاظ پر جما رہے"۔

بہر حال رواج اور عُرف ایک شرعی ماخذ ہے جس پر تین شرائط کے تحت احکام کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے:

۱۔ عُرف نصِ صریح کے خلاف نہ ہو۔

۲۔ وہ عادت جس پر حکم کی بنیاد رکھی جائے غالب ہو۔

۳۔ عُرف عام ہو۔ کیونکہ محدود اور نادر عرف سے عمومی حکم ثابت نہیں ہوسکتا۔ مثلاً کوئی رواج یا عادت صرف ایک ہی شہر کے لوگوں تک محدود ہو۔ یا کوئی ایسا رواج جو کسی علاقے کے طبقۂ خواص کے اندر پایا جاتا ہو مگر طبقۂ عوام میں اُس کا چلن نہ ہو۔ کیونکہ اس قدر محدود پیمانے میں پائی جانے والی کوئی عادت عُرف نہیں ثابت ہوسکتی۔ اور ایک قول یہ ہے کہ محدود عادت سے بھی عُرف ثابت ہوجاتا ہے لیکن اصل مدار جس رائے پر ہے وہ یہ ہے کہ خاص عُرف کا

اعتبار نہیں کیا جائے گا گو بعض فقہاء نے اُس کو معتبر قرار دیا ہے۔[۱]

عُرف پر مبنی احکام اس قدر کثرت سے وارد ہیں جن کا ہم احاطہ نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم چند ایسے احکام بطورِ مثال بیان کر دیتے ہیں جو عرف اور رواج پر مبنی ہیں:

۱۔ مال وقف کرنے والے یا قسم کھانے والے یا نذر ماننے والے کے الفاظ کا وہی مفہوم لیا جائے گا جو عُرف کے مطابق ہوگا۔

۲۔ قاضی (جج) کے لیے تحفہ قبول کرنا جائز نہیں ہے۔ مگر اُس شخص کی طرف سے قاضی تحفہ قبول کر سکتا ہے جو اس کے منصبِ قضا پر متمکن ہونے سے پہلے بھی اُسے تحائف دیا کرتا تھا۔ اِس صورت میں بھی قاضی اس شرط کے ساتھ تحفہ لے سکتا ہے کہ وہ سابقہ معمول سے زیادہ نہ ہو۔ معمول سے زائد چیزیں لوٹا دی جائیں گی۔

۳۔ جاری پانی کی حد کے بارے میں فقہاء کہتے ہیں کہ صحیح مسلک یہ ہے کہ جاری پانی وہ ہے جسے لوگ عادۃً جاری پانی کہتے ہوں۔

۴۔ حیض اور نفاس کے بارے میں فقہاء کا قول یہ ہے کہ اگر خون حیض اور نفاس کی مدتِ مقررہ سے زیادہ آیا ہو تو اس اضافی مدت کو بھی ایام عادت کے اندر ہی شمار کیا جائے گا۔

۵۔ فقہاء نے یہ درست قرار دیا ہے کہ اگر کسی شخص نے اُناکو ملازم رکھا ہو تو اس کا کھانا اور کپڑا بھی ملازم رکھنے والے کے ذمہ ہوگا۔ گو عام ملازمین کے بارے میں یہ صورت اختیار نہ کی جاتی ہو۔

۶۔ "المعروف کالمشروط" کے ضابطے پر جو فروعی احکام استوار ہوتے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ اگر والد اپنی بیٹی کے لیے جہیز تیار کرے اور اسے دے دے اور پھر یہ دعویٰ کرے کہ یہ سامان اُس نے عاریۃً دیا ہے اور اس دعوے میں وہ کوئی ثبوت بھی پیش نہ کرے تو ایک قول یہ ہے کہ اگر لڑکی کا والد شرفاء اور معزز طبقے سے تعلق رکھتا ہو تو اس کا دعویٰ تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر وہ متوسط طبقے کا آدمی

---

[۱] عُرفِ خاص اور عرفِ عام کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے ملاحظہ ہو الاشباہ والنظائر ص ۱۳۴ و ۱۳۵۔ جلد اول مطبعہ عامرہ ۱۲۹۰ ہجری۔

ہو پھر اُسی کی بات کا اعتبار ہوگا۔ لیکن مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ اگر عُرف یہ ہو کہ باپ بیٹی کو جو جہیز دیتا ہے وہ عاریتہً نہیں دیتا بلکہ اس کی ملکیت میں دیتا ہے تو باپ کے دعوے کو رد کر دیا جائے گا اور اگر عرف میں دونوں طرح کے طریقے رائج ہوں تو پھر باپ کا قول معتبر ہوگا۔

۷۔ کاریگروں سے چیزیں بنوانا بھی عُرفی احکام میں شامل ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شخص کسی کاریگر سے یہ کہتا ہے کہ میرے لیے اتنی قیمت پر فلاں چیز تیار کر دو۔ وہ شخص مطلوبہ چیز کا پورا نقشہ بھی اُسے بتا دیتا ہے۔ حنفیہ نے بیع کی اس شکل کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ لوگوں کا عام دستور یہی ہوتا ہے۔ حالانکہ نصاً یہ ممانعت وارد ہے کہ ایسی چیز کی بیع نہ کی جائے جو انسان کے پاس موجود نہ ہو۔

۸۔ عُرفِ عام ہی کی رُو سے اہلِ مدینہ نے دعووں کے تین درجے قرار دیئے ہیں:

پہلا درجہ یہ ہے کہ دعویٰ ایسا ہو جس کے بارے میں عُرف یہ گواہی دیتا ہو کہ یہ دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ دعویٰ قابلِ سماعت ہوگا۔ اس میں مدّعی ثبوت پیش کرے گا یا مدّعا علیہ کو حلف اٹھانا ہوگا۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ دعویٰ ایسا ہو جسے عرف نہ سچا کہتا ہو اور نہ اس کے جھوٹا ہونے کا فیصلہ کرتا ہو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص کسی ایسے شخص کے خلاف جسے وہ نہیں جانتا یہ دعویٰ کرے کہ اُس نے اسے قرض دیا ہے یا اُس کے پاس کوئی چیز مقررہ مدت تک کے لیے اُدھار فروخت کی ہے ایسا دعویٰ بھی قابلِ سماعت ہوگا۔ مدّعی کو ثبوت پیش کرنا ہوگا۔ البتہ فقہاء نے یہ کہا ہے کہ مدّعا علیہ کے انکار کی صورت میں مدّعی اُس سے اس وقت تک حلف اٹھوانے کا حق نہیں رکھتا جب تک وہ یہ نہ ثابت کرے کہ اس کے اور مدّعا علیہ کے مابین میل جول تھا۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ دعویٰ ایسا ہو جسے عُرف جھوٹا کہتا ہو۔ ایسا دعویٰ قابلِ سماعت نہیں ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ ان میں سے ایک مثال یہ ہے کہ سالہا سال کے بعد ایک عورت اپنے خاوند کے خلاف یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اُس نے گرمیوں میں یا سردیوں میں کبھی اُسے کوئی کپڑا نہیں دیا اور نہ اُسے کوئی نان ونفقہ دیا۔ یہ دعویٰ قابلِ سماعت نہیں ہے۔ کیونکہ عام عرف اور رواج ہی اس

دعوے کی تکذیب کرتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ عورت غریب ہو اور شوہر خوشحال۔[۱]

دوسری مثال یہ ہے کہ ایک شخص کو ایک عمارت پر قابض دیکھا گیا ہے۔ اور کئی سالوں سے وہ اس عمارت میں تصرف کر رہا ہے۔ اسے کرایہ پہ دیتا ہے، اسے خود آباد کرتا ہے۔ اسے بناتا اور گراتا ہے اور ساتھ ہی اسے اپنی ملکیت ظاہر کرتا ہے۔ ایک دوسرا آدمی جو سالہا سال تک اس آدمی کو عمارت پر قابض اور متصرف دیکھتا ہے۔ اور اس کی کوئی مخالفت نہیں کرتا اور نہ اس عمارت کے اندر اپنے کسی حق کا کبھی ذکر کرتا ہے، حالانکہ کوئی چیز اسے مطالبہ کرنے میں مانع نہیں ہے۔ مزید برآں یہ کہ قابض اور اس کے درمیان کوئی قرابت نہیں ہے اور نہ میراث وغیرہ میں وہ اس کا شریک ہے لیکن وہ اٹھ کر یکایک یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ مکان اس کا ہے اور وہ اپنے دعوے کا ثبوت بھی پیش کرنا چاہتا ہے۔ تو بجائے یہ کہ اس سے ثبوت طلب کیا جائے اس کا یہ دعویٰ ہی بجائے خود ناقابلِ سماعت ہے۔

تیسری مثال یہ ہے کہ ایک شخص جو فسق و فجور میں اور لوگوں کی ایذا رسانی میں مشہور رہے ایک دوسرے شخص کے خلاف جو دیانت اور راست بازی میں مشہور رہے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اس کے گھر میں نقب لگائی اور اس کا سامان چوری کر لیا ہے یا وہ کسی نیک اور پابندِ دین کے خلاف یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اس کی بیوی سے تعرّض کیا ہے یا اس کے لڑکے کے ساتھ فحش کلامی کی ہے یا فعلِ قبیح کیا ہے تو ایسا دعویٰ اور اسی نوعیت کے دوسرے دعاوی ناقابلِ سماعت ہیں۔ بلکہ الٹا مدعی تعزیر کا مستحق ہے۔ شریعت جس کی بنیاد صداقت اور عدل پر استوار ہے اسی چیز کا تقاضا کرتی ہے۔

۹۔ فقہاء کہتے ہیں اگر یتیم کا سرپرست (وصی)، یہ کہے کہ اس نے یتیم پر اتنا مال صرف کیا ہے تو اگر سرپرست کا دعویٰ اسی قدر ہے جس کا عرف اور عام رواج تقاضا کرتا ہے تو اس کا قول تسلیم کیا جائے گا۔ اور اگر وہ عرف اور عام رواج سے زیادہ مال خرچ کرنے کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے قبول

---

[۱] الطرق الحکمیہ لابن القیم، صفحات ۸۷، ۸۸، ۸۹۔

[۲] ایضاً ص ۹۲۔

نہیں کیا جائے گا۔[۵]

۱۰۔ اگر لڑکے یا لڑکی میں بلوغ کی علامات ظاہر نہ ہوں تو اُن کا سن بلوغ پندرہ سال مقرر کیا گیا ہے۔ یہ مسلک صاحبین (امام محمد اور امام ابو یوسف) کا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کی ایک روایت بھی یہی ہے۔ باقی تینوں ائمہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ انہوں نے اس تحدید کی توجیہ یہ کی ہے کہ ان کے زمانے میں لوگوں کے اندر یہی عادت غالب تھی۔[۶] (یعنی لڑکا اور لڑکی بالعموم ۱۵ سال کے اندر بالغ ہو جاتے تھے)۔

الغرض آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ فقہائے اسلام نے کس کثرت کے ساتھ فقہی مسائل اور قانونی احکام کی بنیاد عرف اور عادت پر رکھی ہے۔ کیونکہ انہوں نے عرف اور عادت کو شریعت کا ایک ماخذ (مذکورہ بالا شروط کے تحت) قرار دیا ہے۔ لیکن یہ حیرت اُس وقت دُور ہو جاتی ہے جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ موزوں اور بہتر قانون وہی ہوتا ہے جس میں قوم کے معاشرتی اور اقتصادی حالات اور اُس کی عادات اور رجحانات کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ بشرطیکہ اس سے کسی خرابی کی توثیق یا کسی مصلحت کا التواء یا کسی واضح اور محکم شرعی نص کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو۔ دوسری جانب یہ خیال بھی رہے کہ لوگوں کے اندر پائی جانے والی کسی غالب عادت کا بزور استیصال اور بلا ضرورت انہیں ان کے عرفِ عام اور رسم و رواج سے ہٹانا ان کے لیے حرج اور تنگی کا موجب ہو گا۔ حالانکہ سب سے بہترین اور بقاء و دوام کا مستحق ترین وہ قانونی نظام ہوتا ہے جس میں آسانی کو مدنظر رکھا گیا ہو اور حرج اور تنگی کا خاتمہ کیا گیا ہو۔ اسلامی شریعت انہی خوبیوں سے مالامال ہے۔

<u>گیارھواں ضابطہ</u>: قاعدۃ سدّ الذرائع (خرابی اور فساد کے اسباب کا قلع قمع کیا جائے گا)

اس ضابطہ کی تشریح یہ ہے کہ ایک کام جو خود خرابی اور فساد سے پاک ہو، اگر کسی خرابی کا ذریعہ بن سکتا ہو تو وہ ممنوع ہے۔ ذریعہ کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ کام جو بظاہر مباح ہو لیکن وہ کسی ممنوع فعل کا سبب اور داعی بنتا ہو۔ ضابطہ سدِّ ذرائع پر کثیر تعداد میں احکام مرتب ہوئے ہیں۔ مثلاً غیر مرد کے ساتھ عورت کی خلوت، یا غیر محرم کے ساتھ عورت کے سفر کو ممنوع قرار دیا گیا ہے تاکہ خرابی اور بے راہ روی جنم

---

[۵] ایضاً ص ۱۲۱ [۶] رد المحتار جلد پنجم ص ۱۰۰۔ مطبوعہ ۱۳۱۸ھ

نہ لے سکے اور آبرو ریزی اور اخلاق کی خرابی کا سدِّ باب ہو۔ مالکیہ کے بارے میں مشہور ہے کہ سدِّ ذرائع کا ضابطہ صرف اُن کے مذہب کی خصوصیت ہے۔ مگر یہ بات علی الاطلاق صحیح نہیں ہے۔ ذرائع تین قسم کے ہوتے ہیں:

۱۔ پہلی قسم اُن ذرائع کی ہے جن کے انسداد و استیصال پر امت کا اجماع ہے۔ مثلاً راستے میں کنوئیں کھودنا ممنوع ہے کیونکہ یہ لوگوں کی ہلاکت کا سبب بن سکتے ہیں۔ اسی طرح ایسے بُت پرست کے پاس بتوں کو گالی دینا ممنوع ہے جس کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ بتوں کو گالی دینے کے جواب میں اللہ تعالیٰ کو سب و شتم کرنے کی گستاخی کرے گا۔

۲۔ دوسری قسم ان ذرائع کی ہے جن کے عدمِ انسداد پر امت کا اجماع ہے۔ جیسے شراب کشید کرنے کے اندیشے سے انگور کی کاشت ہی منع کر دی جائے۔ کیونکہ انگور کی کاشت کی ممانعت کا کوئی قائل نہیں ہے۔ یا مثلاً زنا کے خوف سے مکانات کو ساتھ ساتھ بنانے سے روک دینا۔

۳۔ تیسری قسم ذرائع کی وہ ہے جس میں علماء کا اختلاف ہے۔ جیسے مالکیہ کے نزدیک اُدھار فروخت کرنا ممنوع ہے۔ مثلاً ایک شخص نے دس درہم کے عوض کوئی چیز اُدھار فروخت کی اور پھر اُسے سات درہم نقد کے عوض فوراً خرید لیا۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اس شخص نے اپنے ہاتھ سے سات درہم فوراً اس غرض کے لیے نکالے ہیں تاکہ وہ ادائیگی کی مدت آجانے پر دس درہم وصول کرے۔ یہ گویا سات درہم کو دس درہم کے عوض قرض دینے کا ایک حیلہ ہے۔ گو اس حیلہ کو روبکار لانے کے لیے بیع کی ایک صورت اختیار کی گئی ہے۔ (یعنی امام مالک کے نزدیک بیع کی یہ صورت ربا کے لیے دروازہ کھولتی ہے۔ اس لیے ممنوع ہے)۔ امام شافعی اِسے بیع ہی سمجھتے ہیں۔ اور معاملہ کو ظاہری صورت پر محمول کرتے ہیں۔ اس لیے وہ اسے جائز قرار دیتے ہیں۔ دوسری مثال یہ ہے کہ علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا کوئی قاضی اپنے علم کی بنا پر فیصلہ کر سکتا ہے؟ یعنی کیا یہ حرام ہے کیونکہ یہ بُرے قاضیوں کے لیے باطل فیصلے کرنے کا ایک ذریعہ بن سکتا ہے؟ یا یہ حرام نہیں ہے؟[1] اسی طرح اشیائے خوردنی کے محافظوں کی ضمانت

[1] یہ معلوم کرنے کے لیے کہ قاضی اپنے علم کی بنا پر فیصلہ کر سکتا ہے یا نہیں اور اس مسئلے کے بارے میں ائمہ کے اقوال

کا مسئلہ ہے۔ یعنی نقصان کی صورت میں اُن سے نقصان کا تاوان وصول کرنا تاکہ وہ اشیائے خوردنی کے اندر دست درازی نہ کریں۔

ان تفصیلات سے یہ معلوم ہوا کہ سدِّ ذرائع کا ضابطہ صرف امام مالکؒ اور ان کے پیروؤں کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ سدِّ ذرائع کے اصول پر اُمت کا اجماع ہے۔ البتہ امام مالک نے دوسرے ائمہ کی نسبت اس اصول پر زیادہ عمل کیا ہے۔

قُرطُبی فرماتے ہیں: "امام مالکؒ اور ان کے اصحاب نے سدِّ ذرائع پر عمل کیا ہے۔ جبکہ اکثر علماء نے اسے قانونی اصل کی حیثیت سے اختیار کرنے کی مخالفت کی ہے، اگرچہ انہوں نے اپنے فروعی احکام میں اس پر خوب عمل کیا ہے۔" آگے چل کر فرماتے ہیں: جو کام قطعی طور پر ممنوع اور حرام کاموں کے ارتکاب کا ذریعہ بنتے ہیں اُن کا تعلق اِس قاعدہ سے نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے قاعدے کے ضمن میں آتے ہیں اور وہ قاعدہ یہ ہے کہ مالا اخلاص من الحرام الاّ باجتنابہ ففعلہ حرام (جس کام کو ترک کیے بغیر حرام سے نہ بچا جا سکتا ہو اُس کام کا کرنا بھی حرام ہے)۔ جیسے فقہ اسلامی کا یہ مشہور ضابطہ ہے کہ مالا یتم الواجب الا بہ فہو واجباً (جس کام کے بغیر فرض کی تکمیل نہ ہوتی ہو وہ خود بھی فرض ہو جاتا ہے)۔ اگر کوئی کام قطعی طور پر حرام کے ارتکاب کا موجب نہ بنتا ہو تو پھر وہ تین حالتوں سے خالی نہیں ہوگا۔ یا تو گمانِ غالب ہے کہ وہ ذریعۂ حرام بنے گا یا گمانِ غالب یہ ہے کہ وہ ذریعۂ حرام نہیں بنے گا، یا اس میں دونوں طرح کے گمان مساوی طور پر موجود ہوں گے۔ یہ تینوں صورتیں مالکیہ کے نزدیک ذرائع کہلاتی ہیں۔ اول الذکر صورت میں (جبکہ کسی کام کے ذریعۂ حرام بننے کا گمان غالب ہو) اس کام سے اجتناب ضروری ہے۔ اور دوسری اور تیسری صورت میں ایسے ذریعہ سے اجتناب کے بارے میں امام مالک کے اصحاب میں اختلاف ہے۔[۵]

مذکورہ بالا ضابطے کی قانونی حیثیت کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے۔ مثلاً آپؐ کا یہ ارشاد کہ الحلال بیّن والحرام بیّن وبینھما امور مشتبھات۔ والمومنون

۴۔ کیا ہیں ملاحظہ ہو الطرق الحکمیہ ص ۱۴۷ تا ۱۸۰۔ نیز ملاحظہ ہو نیل الاوطار۔

۵۔ ارشاد الفحول ص ۲۱۷۔ طبعہ صبیح

وقاً فوں عند المشبھات (حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان کچھ ایسے امور ہیں جو مشتبہ اور غیر واضح ہیں۔ اہلِ ایمان کی شان یہ ہے کہ وہ مشتبہ امور پر آکر رک جاتے ہیں) نیز آنحضورؐ کا یہ ارشاد ہے کہ الا وان حمی اللہ معاصیہ فمن حام حول الحمی یوشك ان یواقعہ (آگاہ رہو اللہ کی باڑھوں سے مراد معاصی ہیں۔ جو شخص ان باڑھوں کے ارد گرد گھومتا ہے وہ ان کے اندر گرا جاتا ہے)۔ نیز یہ ارشاد کہ دع ما یریبك الی مالا یریبك (جس کام کے اندر تجھے شبہ ہو اُسے چھوڑ کر وہ کام کر جس میں تجھے کوئی شک نہ ہو)۔

ہر ذریعہ کا سدّباب ضروری نہیں ہے۔ بلکہ بعض اوقات ذریعہ کا دروازہ کھولنا واجب ہو جاتا ہے کبھی مکروہ ہوتا ہے، کبھی مستحب اور کبھی مباح۔ اور جس طرح بدترین مقاصد کا ذریعہ بھی بدترین ذریعہ ہوتا ہے اسی طرح افضل ترین مقاصد کا ذریعہ بھی افضل ترین ذریعہ ہوتا ہے۔ کبھی حرام کا ذریعہ حرام نہیں ہوتا ہے جب کہ وہ راجح مصلحت کا محرک بنتا ہو۔

اسی ضابطے میں سے ایک اور ضابطہ بھی نکلتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ "جب مقصد کا اعتبار ساقط ہو جائےگا تو ذریعہ کا اعتبار بھی بالعموم ساقط ہو جائے گا" کیونکہ ذریعہ حکم میں مقصد کے تابع ہے۔

ابن القیمؒ نے اِس ضابطے کا نہایت عالمانہ اور محققانہ احاطہ کیا ہے اور اس پر نہایت عمدہ اور دلنشین بحث کی ہے۔ اس بحث کی افادیت کی تکمیل کی خاطر ہم ابن القیمؒ کی نفیس و جامع بحث کا خلاصہ یہاں نقل کرتے ہیں۔ ابن القیمؒ نے ذریعہ کی تعریف یہ کی ہے کہ "ذریعہ وہ چیز ہے جو کسی چیز تک پہنچنے کا وسیلہ اور راستہ ہو"۔ اس تعریف کے بعد انہوں نے جو تفصیل بیان کی ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے:

"چونکہ مقاصد تک صرف انہی اسباب و طُرق کی بدولت پہنچا جا سکتا ہے جو اُن تک لے جانے والے ہوتے ہیں، لہٰذا یہ اسباب اور طرق مقاصد کے تابع ہوتے ہیں اور مقاصد کی جو حیثیت ہوگی وہی ان کی ہوگی۔ محرمات اور معاصی کے اسباب و وسائل مکروہ یا ممنوع اس لیے ہیں کہ وہ محرمات و معاصی تک پہنچاتے ہیں اور اُن سے ربط پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح نیکیوں اور تقربّ الٰہی کے ذرائع و اسباب اس لیے محبوب اور جائز ہیں کہ وہ ایک نیک مقصد و غایت تک رسائی کا موجب بنتے ہیں۔ لہٰذا مطلوب کا ذریعہ حکم کے

لحاظ سے مطلوب کے تابع ہی ہوگا۔ اور دونوں میں سے ہر ایک (یعنی مطلوب بھی اور ذریعہ بھی) اصل مطلوب ہی شمار ہوگا۔ ایک مطلوب بربنائے غایت ہے اور دوسرا مطلوب بربنائے وسیلہ ہے۔ (یعنی ایک منزل ہے اور دوسرا اس کا راستہ)۔ لہٰذا اگر شارع نے کوئی چیز حرام ٹھیرادی ہے تو اس کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ اس کی حرمت کو قائم اور ثابت رکھنے اور اس کے قریب جانے سے روکنے کے لیے ایسے تمام وسائل اور طُرق کو بھی حرام اور ممنوع قرار دے جو حرام چیز تک لے جا رہے ہوں۔ اگر شریعت حرام کاموں کے وسائل و اسباب کو مباح رکھتی تو اس طرح ایک طرف تحریم کا مقصد فوت ہو جاتا اور دوسری طرف حرام کاموں کے لیے لوگوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کا سلسلہ جاری رہتا۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت و علم کے منافی ہے"۔

اِس ابتدائی بحث کے بعد ابن القیم نے ذرائع کی چار قسمیں بیان کی ہیں:

۱۔ وہ ذریعہ جو خرابی تک پہنچنے کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔ مثلاً کسی نشہ آور چیز کا پینا جو لازماً نشہ کی خرابیوں کو جنم دیتا ہے، یا قذف جس سے لازماً تہمتِ زنا عائد ہوگی، یا زنا جو لازماً نسل کی آمیزش اور بستر کی ناپاکی پر منتج ہوگا۔ بہرحال اس طرح کے اقوال اور افعال بجائے خود مفاسد اور خرابیوں کو جنم دینے کے لیے وضع کیے گئے۔ اور ان کا بظاہر اور کوئی عمل نہیں ہے۔ چنانچہ شریعتِ اسلامی نے ایسے ذرائع کو ان کی خرابی کے درجہ کے لحاظ سے حرام یا مکروہ قرار دیا ہے۔

۲۔ وہ ذریعہ جو بذات خود مباح ہے، مگر اُسے کسی حرام یا بری بات تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اختیار کر لیا جاتا ہے۔ جیسے حلالہ کی خاطر نکاح کرنا یا سود خواری کے ارادے سے بیع کی آڑ لینا۔

۳۔ وہ ذریعہ جو بذاتِ خود مباح ہے یا مستحب ہے اور اُسے کسی خرابی کے حصول کے لیے قصداً اختیار بھی نہیں کیا گیا، لیکن وہ بالعموم خرابی تک پہنچاتا ہے اور اس کا نقصان اُس کے فائدے پر غالب ہے۔ جیسے کوئی شخص ممنوعہ اوقات میں بلا سبب نفل نماز پڑھے[۹]۔ یا مشرکوں کے سامنے اُن کے دیوتاؤں کو گالی دے یا قبر کے سامنے کھڑے ہو کر قبلہ رُو ہو کر نماز پڑھے یا کوئی عورت اپنے خاوند کی موت کے بعد

---

[۹] یعنی سورج نکلتے وقت یا غروب ہوتے وقت نماز پڑھنا۔

زمانۂ عدت کے اندر زیب و زینت کرے۔

ابن القیم نے مؤخر الذکر دونوں قسموں کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اور اس ممانعت کے ثبوت میں انہوں نے ننانوے وجوہ سے استدلال کیا ہے۔ جس سے علمِ شریعت کے اندر علامہ ابن القیم کی مہارت، تعمق اور پختگی کا کمال ثابت ہوتا ہے۔ ابن القیم کی بیان کردہ وجوہ میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (تم ان معبودوں کو جنہیں یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں گالی نہ دو، ورنہ وہ جواب میں زیادتی کرتے ہوئے بغیر علم اللہ کو گالی دیں گے)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے اصنام اور دیوتاؤں کو گالی دینا حرام قرار دیا ہے، حالانکہ یہ سبّ و شتم محض دینِ خداوندی کی حمیت اور جھوٹے دیوتاؤں کی توہین کی خاطر ہے۔ مگر چونکہ یہ اس بات کا ذریعہ بن جاتا ہے کہ مشرکین خدا کو گالی دیں گے اس لیے یہ حرام ٹھیرا دیا گیا۔ اور مشرکین کے معبودوں کے سبّ و شتم میں جو فائدہ پایا جاتا ہے اس کی نسبت وہ فائدہ زیادہ بہتر اور عظیم ہے جو اللہ تعالیٰ پر سبّ و شتم کا دروازہ بند کر دینے میں پایا جاتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ (اور عورتیں باہر نکلتے وقت اپنے پاؤں کو زمین پر مار کر نہ چلیں تاکہ اس طرح ان کی وہ زینت معلوم ہو جائے جو انہوں نے چھپا رکھی ہے)۔ پاؤں مار کر چلنا بذاتِ خود جائز فعل ہے مگر عورتوں کو اس سے اس لیے منع کر دیا گیا تاکہ ان کا یہ فعل مردوں کو پازیب کی جھنکار سنا دینے کا موجب نہ بن جائے اور ان کے شہوانی جذبات کو بھڑکانے کا محرک نہ ہو۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے جمعہ کی اذان کے وقت بیع و شراء کی ممانعت فرمائی ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ یہ تجارت کے اندر انہماک اور نماز کی حاضری سے محرومی کا ذریعہ نہ بن جائے۔

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طلوعِ شمس اور غروبِ شمس کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ اس ممانعت میں حکمت یہ ہے کہ ان دونوں اوقات میں بعض مشرکین آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین سے ظاہری مشابہت کا دروازہ بند کرنے کے لیے ان اوقات میں نماز پڑھنے

سے منع کر دیا، کیونکہ یہ ظاہری مشابہت کبھی نیت اور عقیدے کی مشابہت تک پہنچ سکتی ہے۔ جب آپؐ نے ایک ذریعہ بعید کو اختیار کرنے سے بھی روک دیا ہے تو قریبی ذرائع تو بدرجۂ اولیٰ ممنوع ہیں۔

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض خواہ کو مقروض کی طرف سے تحفہ لینے سے منع فرمایا ہے تاکہ ایک تو قرض خواہ کہیں اس تحفہ کو اپنے قرض کا ایک حصہ نہ سمجھ لے اور دوسری طرف مقروض اپنے تحفہ کو قرض کی ادائیگی میں تاخیر کرنے کا ذریعہ نہ بنائے۔ اس طرح یہ معاملہ اپنے اصل مدعا کے لحاظ سے سُودی معاملہ بن جائے گا۔

(۶) حاکم اور قاضی کو تحائف قبول کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ حاکم یا قاضی کا ان لوگوں سے تحائف قبول کرنا جن کا پہلے یہ معمول نہ رہا ہو ان کے مقاصد کو پُورا کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے خواہ وہ حقدار نہ بھی ہوں۔

(۷) عورت کو غیر محرم کے ساتھ سفر کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے کیونکہ یہ رفاقت غیر محرم مرد کے لیے عورت سے بُرا لالچ پیدا کر دینے کا موجب بن سکتی ہے۔

(۸) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم سات لہجوں کے بجائے صرف ایک لہجہ میں مرتب فرمایا۔ کیونکہ اگر وہ جمع نہ کرتے تو یہ بات لوگوں کے لیے قرآن میں اختلاف پیدا کر دینے کا ذریعہ بن جاتی چنانچہ صحابہ کرام نے حضرت عثمانؓ کے اس اقدام کی تائید کی۔

۴۔ چوتھی قسم اُس ذریعہ کی ہے جسے وضع ہی فعل مباح کے لیے کیا گیا ہے۔ لیکن کبھی کبھار وہ خرابی کا محرک بھی بن جاتا ہے۔ البتہ اُس میں مصلحت کا پہلو خرابی کے پہلو پر غالب ہے۔ جیسے مرد کے لیے اپنی منگیتر پر نظر ڈال لینا یا اس عورت کو ایک نظر دیکھ لینا جس کے بارے میں گواہی دی گئی ہو۔ یا بعض علماء کے نزدیک کسی سبب خاص کی وجہ سے ممنوعہ اوقات میں نماز پڑھ لینا۔ یا ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہہ دینا۔ ابن القیم کے بیان کے مطابق شریعتِ اسلامی نے اِس چوتھی قسم کو مصلحت و منفعت کے درجات کے لحاظ سے مُباح یا مستحب یا واجب قرار دیا ہے۔

یہ عمدہ بحث آپ کو تفصیل کے ساتھ علامہ ابن القیم کی کتاب اِعلام الموقعین جزءِ ثالث اور ابن تیمیہؒ

کی کتاب التوسل والوسیلہ میں ملے گی۔

بارھواں ضابطہ: من سعی فی نقض ما تم من جهته فسعیه مردود علیه (جس نے اپنے ہی تکمیل کردہ کام کو ضائع کرنے کی کوشش کی تو اس کی یہ کوشش قابلِ قبول نہیں ہو گی)۔ معاملات اور دعاوی کے مباحث میں اس ضابطے کی فروع اور مثالیں بکثرت وارد ہیں۔

(باقی)

ضروری اعلان

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے ۴ ۱۶ غیر مطبوعہ خطوط کا مجموعہ "مکاتیب" جلد اوّل شائع ہو کر اہلِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اب اس کی جلد دوم زیرِ ترتیب ہے جس کا اعلان "مکاتیب جلد اوّل" میں عرض مرتب کے تحت کیا جا چکا ہے۔ وہاں لکھا گیا تھا کہ:

"مکاتیب" جلد دوم میں اگست ۶۸ء کے بعد کے خطوط شامل کیے جائیں گے۔ (کیونکہ جلد اوّل ۶۲ء سے ۶۸ء تک کے خطوط پر مشتمل ہے)۔ اس کے علاوہ کوشش یہ کی جائیگی کہ ایسے تمام خطوط بھی حاصل کر کے اس مجموعے (جلد دوم) میں شامل کیے جائیں جو ۶۲ء سے پہلے لکھے گئے تھے۔ اس سلسلے میں احباب و رفقاء سے یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ جن اصحاب کے پاس مولانا محترم کا کوئی خط یا خطوط (جو مئی ۶۲ء سے قبل کے ہوں) محفوظ ہوں، وہ ازراہ کرم مجھے عاریۃً عنایت کر کے ممنون فرمائیں۔ ان خطوط کو نقل کر لینے کے بعد بحفاظت واپس کر دیا جائے گا۔

امید ہے کہ احباب و رفقاء مجھے اپنے مخلصانہ تعاون سے نوازیں گے۔

عاصم نعمانی ، ۵-الف ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فقر و فاقہ اور اُس کا اسلامی حل

یوسف القرضاوی

تلخیص و ترجمہ: عبدالحمید صدیقی

(۴)

مذموم پیشے | امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "احیائے علوم الدین" میں معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے صنعت و حرفت کی ضرورت پر بحث کرتے ہوئے روزی حاصل کرنے کے مذموم پیشوں کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "بعض پیشے ایسے ہیں جنہیں اپنانے کے لیے ابتدا میں تھوڑی سی محنت اور کوشش کے علاوہ کچھ سیکھنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور کچھ لوگ لڑکپن میں انہیں سیکھنے سے غفلت برت جاتے ہیں یا کسی اور وجہ سے نہیں سیکھ سکتے۔ چنانچہ وہ کسی صنعت یا حرفت سے واقف نہ ہونے کے سبب روزی نہیں کما سکتے۔ لہٰذا وہ دوسروں کی محنت کا پھل کھانے کے درپے ہو جاتے ہیں اس طرح دو گھٹیا پیشے معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ ایک چوری اور ڈاکہ زنی۔ دوسرا بھیک مانگنا اور گداگری۔ عامۃ الناس چوروں اور گداگروں دونوں کے بارے میں محتاط رہتے ہیں اور ان سے اپنے مالوں کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں گروہوں کو دوسروں کے مالوں پر قبضہ کرنے کے لیے مختلف حیلے اور تدابیر سوچنی پڑتی ہیں۔ جہاں تک چوروں اور ڈاکوؤں کا تعلق ہے ان میں ایک تو وہ ہیں جو اپنے بہت سے ساتھی تلاش کر لیتے ہیں اور خود اُن کے سرغنہ بن کر راہ زنی کرتے ہیں اور جو ان میں کمزور ہوتے ہیں وہ مختلف حیلوں مثلاً نقب زنی وغیرہ کے ذریعے مال لوٹتے ہیں۔ اور جہاں تک گداگروں کا تعلق ہے، جب وہ دوسروں کا محنت سے کمایا ہوا مال حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان سے کہا جاتا ہے کہ مشقت اٹھاؤ اور تم بھی دوسروں کی طرح کام کرو، اور انہیں کچھ نہیں دیا جاتا، تو وہ لوگوں کا مال اینٹھنے کے مختلف حیلے

بہلانے اختیار کرتے ہیں اور اپنی بیکاری کے لیے مختلف عذر تلاش کرتے ہیں کچھ وہ ہیں جو اپنے بچوں کو ساتھ لے کر مکاری سے اندھوں کی ایک جماعت بنا کر نکلتے ہیں تاکہ لوگ انہیں معذور جان کر کچھ دیں۔ کچھ وہ ہیں جو اپنے آپ کو اندھے یا اپاہج یا دیوانے یا بیمار ظاہر کرتے ہیں تاکہ لوگوں کے اندر جذبۂ ترحم پیدا ہو اور وہ انہیں کچھ دے دیں کچھ وہ ہیں جو لوگوں کو متحیر کرنے والے بعض اقوال وافعال سیکھ لیتے ہیں جن سے لوگ متاثر ہو کر انہیں کچھ دے دیتے ہیں۔ مثلاً ٹھٹھا مخول، نقل اُتارنا، شعبدہ بازی، مضحکہ خیز حرکات، عجیب و غریب اشعار، مقفیٰ و مسجع نثری کلام، وہ اشعار جو دلوں کو بہت متاثر کریں، یا وہ جو انسان کے سفلی جذبات کو اُبھاریں۔ کچھ ایسے کام جن پر معاوضہ تو لیا جائے مگر وہ معاوضہ سمجھا نہ جائے مثلاً تعویذات وغیرہ کا کاروبار، جن کا بیچنے والا بچوں اور جاہل لوگوں کو دھوکے سے یہ کہتا ہے کہ یہ تعویذات مختلف امراض کا مداوا ہیں۔ یہ فال نکالنے والے، ستارہ شناس، رمّال، منبروں پر چڑھ کر مانگنے والے واعظ بھی انہی لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کے دلوں کو مختلف حیلہ سازیوں سے متاثر کرکے اُن سے روپیہ بٹوریں۔ مانگنے اور سوال کرنے کی یہ حیلہ سازیاں تعداد میں ہزار دو ہزار سے متجاوز ہیں"۔

امام غزالی رحمۃ علیہ نے چوری اور گداگری دونوں مذموم پیشوں کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ یقیناً اُن کی ژرف نگاہی اور دقّتِ نظر پر دلالت کرتی ہیں۔

تدبیر کا فقدان تلاشِ معاش کے لیے سعی و عمل نہ کر سکنے والوں کی آخری قسم اُن لوگوں پر مشتمل ہے جو کام کرنے کی طاقت و قدرت رکھنے کے باوجود کام کرنے کی تدبیر نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وسائلِ معاش اور کمائی کے مختلف طریقوں کے بارے میں اُن کی معلومات بالکل محدود ہوتی ہیں۔ ایسے حالات میں اُن کے لیے یہ بات سب سے آسان ہوتی ہے کہ وہ اپنی اور اپنے کنبے کی کفالت کا بوجھ حکومتِ وقت پر ڈال کر تلاشِ معاش کی ساری کوششوں کو ترک کر دیں اور خود بیکار بیٹھے زندگی کے دن پورے کرتے رہیں۔ مگر اسلام ایسے کسی شخص کے اس طرزِ عمل کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا بلکہ وہ معاشرے کے عام افراد پر عام طور پر اور اصحابِ اختیار و اقتدار پر خاص طور پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ وہ اُس شخص کو اُس کے حسبِ حال کوئی کام

تلاش کر کے دیں اور روزی کما کر کھانے میں اس کی مدد کریں۔ چنانچہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک انصاری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا (اور اپنی بیکاری کی شکایت کرنے لگا) آپؐ نے فرمایا "کیا تیرے گھر میں کچھ نہیں؟" اُس نے عرض کیا "کیوں نہیں، ایک پالان ہے، جسے ہم اُوپر بھی اوڑھتے ہیں اور نیچے بھی بچھاتے ہیں۔ اور ایک پیالہ ہے جس میں ہم پانی پیتے ہیں" آپؐ نے فرمایا "جاؤ وہ دونوں چیزیں لے آؤ"۔ جب وہ شخص دونوں چیزیں لے آیا تو آپؐ نے انہیں لے کر حاضرینِ مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا "ان دونوں چیزوں کو کون خریدتا ہے؟" ایک آدمی نے کہا "میں انہیں ایک درہم میں خریدتا ہوں" آپؐ نے فرمایا "دو یا تین درہم میں کون لیتا ہے؟" ایک دوسرے آدمی نے کہا "میں دو درہموں میں خریدتا ہوں"۔ آپؐ نے پالان اور پیالہ اس آدمی کو دے کر دو درہم لے لیے اور انصاری کو دے کر فرمایا "ایک درہم کا کھانا خرید کر اپنے گھر والوں کو دے آؤ اور دوسرے درہم کی ایک کلہاڑی خرید کر میرے پاس لاؤ۔ پھر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے دستِ مبارک سے اُس میں دستہ لگایا اور فرمایا "یہ کلہاڑی لے کر جاؤ اور جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لایا کرو اور انہیں بیچا کرو۔ اور پندرہ دن تک میرے پاس مت آنا" وہ شخص چلا گیا اور لکڑیاں کاٹ کر بیچتا رہا۔ جب پندرہ دن کے بعد آیا تو وہ دس درہم کما چکا تھا جن میں سے کچھ درہموں کا اس نے کپڑا اور کچھ کا کھانا دانہ خریدا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس سے فرمایا "یوں کما کر کھانا تمہارے لیے بہتر ہے اس سے کہ لوگوں سے مانگتے پھرنے کے سبب قیامت کے روز تمہارا چہرہ داغدار ہو۔ سوال کرنا صرف تین آدمیوں کے لیے درست ہے۔ ایک نہایت مفلس آدمی۔ دوسرے جو بہت بھاری قرض کے نیچے دبا ہُوا ہو اور تیسرے وہ جس پر بھاری دیت پڑ گئی ہو"۔

اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کے لیے اس بات کو اچھا نہیں سمجھا کہ وہ کمانے کی طاقت رکھنے کے باوجود زکوٰۃ و صدقات لے کر اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرے، بلکہ کسبِ حلال کے مواقع فراہم کرنے میں اُس کی مدد کی۔

فقر و فاقہ کے مسئلے کو حل کرنے میں اسلام اُن تمام نظام ہائے زندگی سے کوسوں آگے ہے جو ظہورِ اسلام سے کئی صدیاں بعد انسانیت کے سامنے پیش کیے گئے۔ وہ کسی حاجتمند سائل کی مشکل کو یوں حل نہیں کرتا کہ

وقتی طور پر اُسے کچھ مادی امداد دلوا دے اور نہ وہ محض وعظ و تلقین سے سائل کے دل میں سوال کرنے سے نفرت پیدا کر دینے پر اکتفاء کرتا ہے بلکہ وہ سائل کی دستگیری کرتا ہے اور بڑے احسن طریقے سے غربت و افلاس سے نجات حاصل کرنے میں اس کی مدد کرتا ہے۔ اور اسے اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ وہ اپنی معاشی حالت کو درست کرنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور دوسروں کے آگے دستِ سوال دراز کرنے سے گریز کرے۔

ازالۂ فقر و فاقہ کے لیے دوسرا وسیلہ | فقر و فاقہ کے ازالہ کے لیے دینِ اسلام میں اگرچہ یہ چیز اصل الاصول کی حیثیت رکھتی ہے کہ ہر شخص کو کوشش اور محنت کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر فقر و فاقہ کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ مگر اُن معذوروں کا کیا گناہ ہے جو کام کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے؟ اُن بیواؤں کا کیا قصور ہے جن کے خاوند انہیں بالکل کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں؟ چھوٹے چھوٹے بچوں اور نہایت بوڑھے آدمیوں کا کیا گناہ ہے؟ مُزمن امراض میں مبتلا لوگوں کا کیا گناہ ہے؟ اور ان لوگوں کا کیا گناہ ہے جو بعض آفاتِ ناگہانی کے باعث کام اور کسب سے محروم ہو گئے ہیں؟ کیا ایسے افرادِ معاشرہ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے گا؟

نہیں۔ اسلام نے اِن افراد کو بھی فقر و فاقہ اور محتاجی و تنگ دستی کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے انتظام کیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی چیز یہ ہے کہ ایک خاندان کے افراد ایک دوسرے کا پاس کریں اور ایک دوسرے کی اعانت و کفالت کا ذمّہ لیں، طاقت ور کمزور کے کام آئے، دولتمند اپنے فاقہ مست بھائی کا کفیل بن جائے، اصحابِ قدرت و اختیار اپنے معذور و مجبور رشتہ داروں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دیں۔ کیونکہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک خاندان کے افراد کے باہمی تعلقات زیادہ ہوتے ہیں، اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ لطف و کرم سے پیش آتے ہیں اور وہ رحم کے رشتے میں ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں۔ یہ ایک آفاقی حقیقت ہے جس کی اسلام نے بدیں الفاظ تائید فرمائی ہے:

وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۔ (انفال: ۷۵)

اور اللہ کی کتاب میں خون کے رشتے دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہوتے ہیں۔

قرابت داری اور صلہ رحمی | اسلام نے قرابت داروں کے حقوق پر بڑا زور دیا ہے۔ قرآن و حدیث میں اُن کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرنے کی ترغیب دلائی ہے، اور قطع رحمی اور قرابت داروں سے بدسلوکی کرنے والوں کو سخت عذاب کی وعید سنائی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی ۔ (النحل: ۹۰)	اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔
وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۔ (النساء: ۳۶)	اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ اور پڑوسی، رشتہ دار سے اور اجنبی ہمسایہ سے اور پہلو کے ساتھی اور مسافر سے اور اُن لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہوں احسان کا معاملہ کرو۔ یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔
وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَ الْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا۔ (النساء: ۱)	اُس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔
وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ۔ (الاسراء: ۲۶)	رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق اور فضول خرچی نہ کرو۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۔ (الروم : ۳۸)

پس (اے مومن !) رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین و مسافر کو اس کا حق یہ طریقہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہتے ہوں ۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ (بخاری و مسلم)

جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اُسے چاہیے کہ وہ صلہ رحمی کرے ۔

الرَّحِمُ مُعَلَّقَةٌ بِسَاقِ الْعَرْشِ تَقُوْلُ مَنْ وَصَلَنِيْ وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَنِيْ قَطَعَهُ اللّٰهُ (بخاری و مسلم)

رحم عرشِ الٰہی کے پائے سے لٹکا ہوا ہے کہتا ہے "جو مجھے جوڑے اُسے قربِ الٰہی نصیب ہو اور جو مجھے توڑے وہ بارگاہِ الٰہی سے کٹ جائے !

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی کرنے کو واجب قرار دے دیا ہے کہ "تو اپنے ماں باپ اور بہن بھائی سے بھلائی کر اور اُس قریبی رشتہ دار سے احسان کر جو ان سے قریب ہو ۔ یہ ایک ایسا حق ہے جسے ادا کرنا ضروری ہے اور خون کے رشتے اس قابل ہیں کہ انہیں قائم رکھا جائے ۔"

قرآن و حدیث سے ماخوذ مذکورہ بالا نصوصِ صریحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک قرابت دار کا اپنے قرابت دار پر دوسرے تمام انسانوں سے زیادہ حق ہے ۔ کیونکہ ان کے درمیان قرابت اور رشتہ داری ہوتی ہے ۔ اگر کوئی شخص اپنے رشتہ دار کی بدحالی اور بیکاری کے وقت اُس پر اور اُس کے بال بچوں پر خرچ نہ کرے تو وہ حقِ قرابت کو کماحقہٗ ادا نہیں کرتا ۔ جب کوئی شخص اپنے کسی قریبی کی موت کے بعد اس کی جائیداد کا وارث بن کر مفت میں کچھ دولت حاصل کر سکتا ہے تو پھر عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے قریبی رشتہ دار کی بدحالی کے وقت اس پر بغیر کسی ذاتی مفاد کے خرچ بھی کرے ۔ اور اس کو اُس مفت ہاتھ آنے والی دولت کا عوض سمجھ لے جو قریبی کی موت کے

بعد اُسے مل سکتی تھی۔

بعض علماء کا کیا خیال ہے کہ مذکورہ بالا نصوصِ صریحہ میں جس احسان اور صلۂ رحمی کا ذکر آیا ہے وہ واجب نہیں بلکہ محض مُستحب ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رشتہ داروں کے ساتھ احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیا ہے اور اسے حق سے تعبیر فرمایا ہے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے رشتہ داروں کا حق فرما کر واجب قرار دیا ہے تو پھر یہ مستحب کس آیتِ قرآنی اور حدیثِ نبوی سے ہوا؟

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ حق سے مراد صرف یہ ہے کہ قطع رحمی نہ کی جائے تو اس کا جواب یہ ہے جیسا امام ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے:

(۱) اس سے بڑھ کر قطع رحمی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص دیکھ رہا ہو کہ اس کا رشتہ دار بھوک اور پیاس سے تڑپ رہا ہے اور گرمی یا سردی کے سبب سخت تکلیف میں مبتلا ہے۔ اور وہ اس کو ایک لقمہ کھانا نہ دے اور ایک گھونٹ پانی نہ دے اور نہ اُسے ستر پوشی اور سردی گرمی سے بچنے کے لیے کپڑا دے۔ حتیٰ کہ اُسے اپنی چھت کے سائے میں آرام تک نہ لینے دے۔ اگر یہ قطع رحمی نہیں تو ہم نہیں جانتے کہ پھر وہ قطع رحمی کیا ہے جسے حرام کہا گیا ہے اور وہ صلہ رحمی کیا ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

(۲) وہ صلہ رحمی کیا ہے جسے قرآن و سنّت میں واجب قرار دیا گیا ہے۔ اور جسے ترک کرنے والے کی مذمت کی گئی ہے، صلۂ رحمی میں ایک عام آدمی کے حق سے کونسی چیز زاید ہے جسے دل و دماغ سمجھ سکیں اور اس پر عمل کیا جا سکے؟

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھائی بہن کے حق کو ماں باپ کے حق کے ساتھ ذکر کیا ہے ارشاد ہے امك وابالك واختك واخاك ثم ادناك ادناك (اپنے ماں باپ سے بھلائی کر اور اپنی بہن بھائی سے بھلائی کر، پھر جو رشتہ میں اُن سے قریب ہوں اور پھر جو اُن سے قریب تر ہوں)۔ پھر وہ کونسی چیز ہے جس سے یہ حکم منسوخ ہو سکتا ہے؟ اور وہ کونسی چیز ہے جو پہلے (حقوقِ والدین)

کو واجب قرار دے اور دوسرے (بہن بھائی کے حقوق) کو مستحب رہنے دے؟

فقہائے امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ خاوند کو اپنی بیوی کے نان نفقہ کے لیے اور والد کو اپنے اور لڑکی کے نفقہ اور بیٹے کو والدین کے نفقہ کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اور باقی اقرباء اور رشتہ داروں کے متعلق اس بارے میں اختلاف ہے کہ اسلامی ریاست کا قاضی کسی رشتہ دار کو رشتہ دار پر خرچ کرنے پر کس حد تک مجبور کر سکتا ہے۔ اگرچہ اُن اقرباء اور رشتہ داروں سے صلۂ رحمی اور احسان کو سب فقہاء نے دینی نقطۂ نگاہ سے ضروری قرار دیا ہے۔

اس سلسلے میں تمام مذاہبِ اسلامیہ میں سے امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہا اللہ کے مذاہب میں کافی وسعت پائی جاتی ہے۔ اور امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں اماموں کے مذاہب کی تائید میں کتاب و سنت سے بہت سے دلائل پیش کیے ہیں۔ زاد المعاد میں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجۂ ذیل احادیث نقل کرتے ہیں جو خویش و اقارب پر خرچ کرنے کے بارے میں ہیں:

سنن ابی داؤد میں کلیب ابن منفعۃ الحنفی سے روایت کی گئی ہے۔ وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ وہ (کلیب کے دادا) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی کہ "اے اللہ کے رسول! میں کس کے ساتھ احسان کروں؟" آپ نے فرمایا "اپنے ماں باپ کے ساتھ، پھر اپنے بہن بھائی کے ساتھ، اور پھر اپنے رشتہ دار کے ساتھ جو اُن سے قریب ہے۔" یہ ایک ایسا حق ہے جسے ادا کرنا ضروری ہے اور رحم کے رشتے اس قابل ہیں کہ انہیں قائم رکھا جائے۔

نسائی میں طارق محاربی سے روایت ہے کہ جب میں مدینے آیا تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر کھڑے خطبہ دیتے ہوئے فرما رہے تھے "دینے والے کا ہاتھ اُونچا ہے اور دینے کی ابتدا اپنے اہل و عیال سے کرو۔ پہلے ماں باپ کو دو، پھر بہن بھائی کو، پھر جو زیادہ قریب ہو اور پھر جو اُس سے قریب ہو۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضور نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی "اے اللہ کے رسولؐ! تمام انسانوں میں سے کون سب سے زیادہ حقدار ہے اس بات کا کہ میں اس سے حسنِ سلوک سے پیش آؤں؟ آپؐ نے فرمایا "تیری ماں"۔ اس نے کہا "پھر کون"؟ آپؐ نے فرمایا "تیری ماں"۔ اس نے کہا "پھر کون"؟ آپؐ نے فرمایا "تیری ماں" اس نے کہا "پھر کون"؟ آپؐ نے فرمایا "تیرا باپ، پھر وہ جو زیادہ قریب ہو اور پھر وہ جو اس سے زیادہ قریب ہو"۔

ترمذی میں معاویہ قشیری سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا "اے اللہ کے رسولؐ! میں کس کے ساتھ احسان کروں؟ آپؐ نے فرمایا "اپنی ماں کے ساتھ"۔ میں نے پوچھا "پھر کس کے ساتھ"؟ آپؐ نے فرمایا "اپنی ماں کے ساتھ"۔ میں نے پوچھا "پھر کس کے ساتھ"؟ آپؐ نے فرمایا "اپنے باپ کے ساتھ۔ پھر اس کے ساتھ جو زیادہ قریبی ہو"۔

سُنن ابی داؤد میں عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بلاشبہ بہترین کھانا وہ ہے جو تم خود کما کر کھاؤ۔ تمہاری اولاد بھی تمہاری ایک طرح کی کمائی ہے، تم اپنی اولاد کی کمائی سے بھی بلا کسی مشقت کے کھاؤ"۔

نسائی میں جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "پہلے اپنے آپ پر صدقہ کرو۔ اور اگر کچھ بچ جائے تو اپنے گھر والوں پر، اگر تمہارے گھر والوں سے بھی کچھ بچ جائے تو اپنے قرابتداروں پر، اور تمہارے قرابتداروں سے بھی کچھ بچ جائے تو اس طرح اور اس طرح" (یعنی پھر ان پر جو ان کے قریبی ہوں اور پھر ان پر جو ان قریبیوں کے قریبی ہوں)۔

منقولہ بالا تمام احادیث مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی کی تفسیر ہیں:۔

(۱) وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى (النساء: ۳۶)	اور تم سب اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ، قرابتدار کے ساتھ نیک برتاؤ کرو
(۲) وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (الاسراء: ۲۶)	قرابت دار کو اس کا حق دو۔
(۳) فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (الروم: ۳۸)	قرابت دار کو اس کا حق دو۔

اللہ تعالیٰ نے قرابت داروں کے حق کو والدین کے حق کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی۔ اگر یہ حق حقِ نفقہ نہیں ہے تو پھر ہم نہیں جانتے کہ وہ کون سا حق ہے؟ اور اللہ نے قرابداروں کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ تو بہت بڑی بدسلوکی ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی رشتہ دار کو دیکھے کہ وہ بھوکا ننگا مر رہا ہے اور وہ اس کی تنگ دستی کو دُور کرنے اور ستر پوشی کرنے کی قدرت رکھنے کے باوجود اُسے کھانے کا ایک لقمہ نہ دے اور اس کی ستر پوشی نہ کرے۔ اور اگر کرے تو قرض دے کر۔

(باقی)

تفہیم القرآن کے اجزا البقرہ، المائدہ، یوسف، النُّور، اور الاحزاب کے بعد

اسلامیات کے طالب علموں کی سہولت کی خاطر

تفسیر سورۂ حُجُرات

بھی علیحدہ کتابی شکل میں شائع کر دی گئی ہے۔

ضخامت ۶۰ صفحات۔ $\frac{23 \times 18}{8}$ کاغذ سفید۔ قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے

ادارۂ ترجمان القرآن

۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور سے

طلب فرمائیے

مطبُوعات

CONCEPT OF MUSLIM CULTURE IN IQBAL

اقبالؒ کے کلام میں مسلم تمدن کا تصور

تالیف: جناب مظہر الدین صاحب

شائع کردہ: ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی۔ اسلام آباد، پاکستان

صفحات ۲۴۴۔ قیمت دس روپے

فاضل مصنف کے خیال کے مطابق اُن کی یہ علمی کاوش ڈاکٹر اقبال مرحوم کے خیالات کی توضیح ہے۔ اس کام کے لیے انہوں نے اسلامی فقہ، اسلامی الٰہیات اور علمِ کلام اور اسلامی تصوف کے بارے میں موجود لٹریچر کو خوب کھنگالا ہے۔ مگر یہ بات بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتی ہے کہ انہوں نے اقبال مرحوم کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ان کے کلام سے استنباط کرتے ہوئے بعض ایسے نتائج پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں تجدد پسندی کا رنگ پُوری طرح جھلکتا ہے اور جو اقبال کے پُورے نظامِ فکر سے مغائرت رکھتے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھنے سے قاری کے ذہن میں یہ تأثر قائم ہوتا ہے کہ اقبال عقل کے پرستار تھے اور کسی دینی معاملے کی صحت کو پرکھنے کے لیے وہ عقل ہی کو آخری معیار تسلیم کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک ہر شخص کو اجتہاد کا پورا حق حاصل تھا اور وہ اس حق کو کسی مخصوص گروہ کی اجارہ داری نہ سمجھتے تھے۔ وہ اسلام کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے شدومد سے حامی تھے اور اس راہ میں اگر کوئی قولِ رسول یا فعلِ رسول حائل ہوتا نظر آئے تو اسے نظر انداز کر دینے کے حامی تھے۔

یہ ہے اقبال مرحوم کے خیالات کا وہ انداز جو شروع سے آخر تک اس کتاب میں ملتا ہے۔

فاضل مصنف نے اپنے نظریات جن مفروضات پر قائم کیے ہیں ان کی حیثیت بھی کافی حد تک محلِ نظر ہے۔ مثلاً انہوں نے صفحہ ۹۱ پر حدیث کے بارے میں ابن قتیبہ کی جو رائے پیش کی ہے وہ درست

نہیں۔ پھر انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے جو یہ بات منسوب کی ہے کہ وہ حضورؐ کی سنت کی پیروی تو کرتے تھے مگر اُن کے خاص فیصلوں کی پابندی نہیں کرتے تھے (صلا۱۲) یہ بھی غلط ہے۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جو تین چار واقعات ایسے ملتے ہیں، محدثین اور علماء نے اُن پر سیر حاصل بحث کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے کوئی فیصلہ بھی سنت کے خلاف نہ تھا۔

صلا۱۳ پر انہوں نے ائمہ پر سنت سے انحراف کا جو الزام عائد کیا ہے وہ حد درجہ افسوسناک ہے۔ مصنف کے الفاظ ذرا ملاحظہ ہوں:

"حدیث کو رد تو نہ کیا جاتا تھا مگر اسے صحیح معنوں میں نافذ بھی نہ کیا جاتا۔ جہاں حالات کا اقتضا سنت کو نظر انداز کرنے کا ہوتا تو فقہاء بلا تامل ایسا کر دیتے۔"

فقہاء پر یہ ایک ایسا سنگین الزام ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔ ائمہ اور فقہاء تو بات کرنے سے پہلے یہ کہہ دیتے تھے کہ ہمارا وہی قول قابلِ قبول ہے جس کی تائید قرآن و سنت سے ہوتی ہو۔ معلوم نہیں فاضل مصنف نے ائمہ کے بارے میں حدیث سے بے نیازی کا یہ طرزِ عمل کہاں سے اخذ کیا ہے۔ مثلاً امام مالکؒ یہ کہا کرتے تھے: "میں انسان ہوں۔ مجھ سے خطا ہو سکتی ہے، سو میری بات کو قرآن و سنت سے پرکھ لیا کرو۔" اسی طرح امام شافعیؒ کا یہ قول بھی مشہور ہے: "جب تمہارے پاس کوئی ایسی حدیث پہنچے جو میرے قول سے متصادم ہو تو میرے قول کو اٹھا کر دیوار کے ساتھ پھینک دو۔" اس سلسلے میں امام ابو حنیفہؒ اور دیگر ائمہ و فقہاء نے بھی حدیثِ رسولؐ کے معاملے میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

کتاب کا معیار طباعت خاصا اونچا ہے۔

دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر، تالیف: پروفیسر محمد اسلم صاحب شعبۂ تاریخ، جامعہ پنجاب، لاہور۔ شائع کردہ: ندوۃ المصنفین، سمن آباد۔ لاہور۔ قیمت ساڑھے سات روپے۔ صفحات ۲۵۶۔

مجدد الف ثانیؒ کے تجدیدی کارنامے کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اکبر کی دینی سرگرمیوں

کو ٹھیک طرح سے سمجھا جائے۔ کیونکہ یہ سرگرمیاں مجدد صاحب کی تحریک کے لیے پس منظر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پروفیسر محمد اسلم صاحب نے اپنی اس قابلِ قدر تصنیف میں اس پس منظر کو صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں فاضل مصنف نے اس بڑی غلط فہمی کا ازالہ بھی کیا ہے کہ اکبر کا دینِ الٰہی مختلف مذاہب کے اچھے عقائد اور اعمال کا محض ایک ملغوبہ تھا جس کی غرض صرف یہ تھی کہ ہندوستان میں آباد ہونے والی مختلف قوموں کے درمیان کسی پائیدار اتحاد کی راہ ہموار کی جاسکے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اکبر نے اسلام کو بالکل تیاگ کر کفر کی راہ اختیار کرلی تھی۔ اس کے فکر و عمل میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے اس کی اسلام سے کوئی معمولی مناسبت بھی ظاہر ہوتی ہو۔ کتاب کے آخر میں پروفیسر صاحب نے "اکبر نے کیا کھویا" کے عنوان سے جو مواد فراہم کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر دین کا سخت دشمن تھا۔ جس شخص کو نماز روزے، حج اور زکوٰۃ سے چڑ ہو اور محمدؐ جیسے مقدس نام سے عداوت رکھتا ہو، اس کے بارے میں آخر یہ کس طرح تصور کیا جاسکتا ہے کہ اُسے اسلام سے کوئی معمولی تعلق بھی ہے۔ اکبر کا دور درحقیقت ہندوستان میں ظلمت کا دَور تھا جس میں ایک مطلق العنان حکومت کے پورے ذرائع اور وسائل اسلام کو اس سرزمین سے ختم کرنے اور کفر و الحاد کو غالب کرنے کے لیے صرف ہوئے۔ خداوند تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا اور اس نے بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کے سارے مذموم عزائم دنیوی اعتبار سے بالکل ایک بے سروسامان، مردِ حق آگاہ کی کوشش سے خاک میں ملا دیئے۔ مجدد علیہ الرحمۃ کی سعی و جہد کو اللہ تعالیٰ نے اسقدر برکت عطا کی کہ دھارے کا رُخ بدل گیا۔ ہم جب ہندوستان کی تاریخ اور خاص طور پر عہدِ مغلیہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں دینی رجحانات کے اندر گہرے تغیرات کے دو واضح رجحانات ملتے ہیں۔ بابر سے لیکر اکبر تک دینی اعتبار سے مسلسل انحطاط کا دور رہے۔ یعنی انحطاط کا جو رجحان بابر سے شروع ہوا وہ اکبر کے دَور میں اپنی انتہا تک پہنچ گیا۔ مگر اس کے بعد پھر عروج کا آغاز ہوا اور ہر آنے والا حکمران دینی احساسات کے معاملے میں پہلے سے بہتر ثابت ہوا۔ اس تغیر کی بنیادی وجہ مجدد الف ثانی کی جدوجہد تھی۔

کتاب کے آغاز میں فاضل مصنف نے ماخذ پر جو بحث کی ہے وہ کافی عمدہ ہے اور خاص طور پر

مُلّا عبدالقادر بدایونی کو متعصب اور کاذب ثابت کرنے کی جو کوششیں وقتاً فوقتاً کی جاتی ہیں ان کے پسِ پردہ محرکات بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ یہ کتاب ہمارے تاریخی اور دینی ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ معیارِ طباعت پسندیدہ ہے

تاریخ تصوّف | تالیف۔ عبدالصمد صارم الازہری، شائع کردہ۔ ادارۂ علمیہ ۵ دھنی رام روڈ بنی انارکلی لاہور۔ صفحات ۲۹۲۔ قیمت دس روپے۔

فاضل مصنف علمی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ تاریخ القرآن، تاریخ التفسیر اور تاریخ الحدیث لکھ کر اہلِ علم میں پُوری طرح متعارف ہو چکے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی مفید کڑی ہے۔ اس میں مصنف نے نہ صرف تصوّف کے مختلف سلاسل اور طُرق بیان کیے ہیں بلکہ ان کے ارتقاء پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ تصوف کے نام پر مسلم معاشرے میں جو بہت سی بدعات رواج پا چکی ہیں اُن کی بھی مصنف نے نشان دہی کی ہے۔ کتاب کے آخر میں انہوں نے تصوّف کا جو نچوڑ، "ولی کی شناخت" کے عنوان کے تحت پیش کیا ہے، اسی سے اُن کی سلامتیٔ فکر ظاہر ہوتی ہے۔

> "جس کو جس درجہ بسنت پر استقامت ہو گی وہ اسی درجہ کا صاحبِ کمال ولی ہو گا"۔

> "ولی معصوم نہیں ہوتا۔ اس سے غلطی و خطا ہو جاتی ہے مگر وہ متنبہ ہو کر تائب ہو جاتا ہے۔ اور اس کو ترک کر دیتا ہے۔"

کتاب کا معیار کتابت و طباعت ناقص ہے۔

(بقیہ اشارات)

معاملہ پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ اگر موجودہ حکومت اس معاملے کی سنگینی کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس طرف ذرا توجہ دے تو حالات بہت کچھ سدھر سکتے ہیں۔ ابھی پانی سر سے نہیں گزرا کہ کچھ کیا نہ جا سکے۔

سیاسی میدان سے ہٹ کر بھی اگر دیکھا جائے تو سماج دشمن عناصر نے ملک کے اندر جو اودھم مچا رکھا ہے اس نے لوگوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں اچھا خاصا مایوس کر دیا ہے۔ قتل و غارت، اغوا، ڈاکہ زنی، چوری کی وارداتیں اس قدر تیزی سے بڑھتی جا رہی ہیں کہ شریف آدمی کے لیے جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ کوئی شخص نہیں جانتا کہ ایک لمحہ کے اندر اس کی زندگی، اور اس کی عزت و آبرو کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ شدید خوف و ہراس کے عالم میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس دہشت زدہ ماحول میں وہ ملک و ملت کے مسائل کے بارے میں آخر کس طرح سنجیدگی سے غور کر سکتا ہے؟ اس کی نظر میں مارشل لا کا اگر کوئی فائدہ ہو سکتا تھا تو یہی کہ اس میں کوئی فرد یا گروہ قانون شکنی کی جرأت نہ کر سکتا۔ لیکن جب امن و امان قائم کرنے کا یہ آخری حربہ بھی ناکام ہوتا نظر آتا ہے اور عوام مارشل لا کے اندر بھی سماج دشمن عناصر کی تخریبی سرگرمیوں سے اپنے آپ کو محفوظ نہ پائیں تو ان کے اندر شدید مایوسی کا پیدا ہو جانا بالکل فطری امر ہے۔ یہ ایک ایسی فضا ہے جو اشتراکیت کو بڑی راس آتی ہے۔

صدرِ محترم کو اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ ان کی حکومت کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار نہ کرے جس سے ملکی حالات میں مزید بگاڑ پیدا ہو۔ انہیں اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ کسی معاشرے

کی معاشی بدحالی اشتراکیت کو فروغ دینے میں مددگار ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمارے اس ملک میں بھی حکومت کی غلط معاشی پالیسیوں کی وجہ سے غریب طبقہ اس قدر مفلوک الحال ہو گیا ہے کہ اسلام سے محبت رکھنے کے باوجود وہ کبھی کبھی اشتراکیت کی طرف محض اس لیے مائل ہو جاتا ہے کہ اس سے سرمایہ داری کی لعنتوں کا خاتمہ ہو گا۔ اس ملک کے اوپر کے طبقوں میں اشتراکیت کو راہ پانے کا جو موقع ملا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس نظام کو اپنانے سے انہیں اخلاقی ذمہ داریوں سے نجات ملتی ہے۔ مگر غریب طبقوں کے اندر اشتراکیت کے لیے جو تھوڑی سی کشش پیدا ہوئی ہے اس کی وجہ محض غربت و افلاس ہے۔ ہمارے حکمرانوں کو یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اُن کے جس اقدام کی زد یہاں کے غریب عوام پر پڑتی ہو اُس سے لازمی طور پر اشتراکی حلقوں کو فائدہ پہنچے گا۔ ہر آن بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور ضروریاتِ زندگی کی بے تحاشا گرانی سے ملک کے اندر بے چینی بڑھے گی اور عوام صورتِ حال کی اصلاح کے پُرامن راستوں سے مایوس ہو کر تخریب پسندانہ روش اختیار کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اس سلسلے میں موجودہ حکومت سے کئی ایک لغزشیں ہوئی ہیں مگر اس نوع کی سب سے بڑی لغزش اس سال کا مرکزی بجٹ ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ حکومت بے جا مصارف میں کمی کرتی اور ٹیکسوں کی وصولی میں زیادہ مستعدی کا ثبوت دیتی اور اس امر کی کوشش کرتی کہ جو لوگ ناجائز ذرائع استعمال کر کے اس بوجھ سے بچ جاتے ہیں ان کا اچھی طرح محاسبہ کر کے ان سے ٹیکس وصول کیے جائیں۔ مگر حکومت نے اس صحیح راستہ کے بجائے معاشی اعتبار سے پسے ہوئے مفلوک الحال لوگوں پر ٹیکس کا ناقابلِ برداشت بوجھ ڈال دیا ہے۔

جس دن سے بجٹ کا اعلان ہوا ہے اس دن سے ایک طرف تو قیمتوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف بیروزگاری بڑھ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ غریب لوگ جو معاشی اعتبار سے پہلے ہی سخت بدحال ہیں، اب مزید پریشان ہو گئے ہیں۔ یہ تشویشناک صورتِ حال ملک کے مستقبل کے لیے بڑی خطرناک ہے اور اس سے تخریب پسند عناصر کو غیر قانونی اور تشدد پسندانہ سرگرمیاں جاری رکھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

ایمان و یقین مستحکم کرنے کے لیے بہترین کتاب

تفہیمات

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامی عقائد اور احکام کی دلنشین تشریح

حصہ اوّل

- توحید و رسالت کے اثبات میں ایمان افروز بحث
- منکرینِ حدیث کے اعتراضات کا مدلّل جواب
- قرآن مجید کے مشکل مقامات کی دلنشین تشریح
- اعلیٰ ایڈیشن : ۹/۲۵ روپے
- سستا ایڈیشن : ۶/۵۰ روپے

حصہ دوم

- قرآنی واقعات کی تحقیق و تشریح
- اسرائیلی افسانوں کا تجزیہ۔
- تہذیبِ نو کے پیدا کردہ مسائل کا اسلامی حل۔
- مغربی فلسفوں کا تجزیہ اور تنقید۔
- اعلیٰ ایڈیشن ۱۲/- روپے سستا ایڈیشن ۷/- روپے

حصہ سوم

- اسلامی فقہ کی اہمیت اور صحیح مقام۔
- اجتہاد کے شرائط اور اصول۔
- اسلامی احکام کی مدلّل تشریح و توضیح۔
- عصرِ حاضر کے مسائل کا اسلامی حل۔
- اعلیٰ ایڈیشن : ۸/۲۵ روپے
- سستا ایڈیشن : ۵/- روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
۱۳- ای، شاہ عالم مارکٹ، لاہور
۱۶- بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ

اسلام کی دعوت کے انقلابی پہلو اور عملی شکلوں کو سمجھنے کیلئے عظیم کتب

تجدید و احیائے دین

تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل

سید ابوالاعلیٰ مودودی

◉ بزرگانِ دین کے تجدیدی کارناموں کا مفصل تذکرہ۔
◉ احیائے دین کیلئے شرائط و لوازم
◉ اعلیٰ ایڈیشن : ۴/۲۰ روپے
◉ سستا ایڈیشن : ۲/۲۰ روپے

◉ عصرِ حاضر میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے مفصل لائحہ عمل۔
◉ پاکستان کی عظیم اسلامی تحریک کا جامع منصوبہ
◉ اعلیٰ ایڈیشن : -/۴ روپے
◉ سستا ایڈیشن : ۲/۲۵ روپے

دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
مولانا امین احسن اصلاحی
میاں طفیل محمد

اعلیٰ ۴/۷۵ روپے
سستا ۲/۶۰ روپے

◉ اسلام کیا ہے اور اس کے عملی تقاضے کیا ہیں
◉ اسلام کے انقلابی پہلوؤں کی ایمان افروز تشریح

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳- ای، شاہ عالم مارکٹ، لاہور۔
۱۶- بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ